(طنز و مزاح)

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

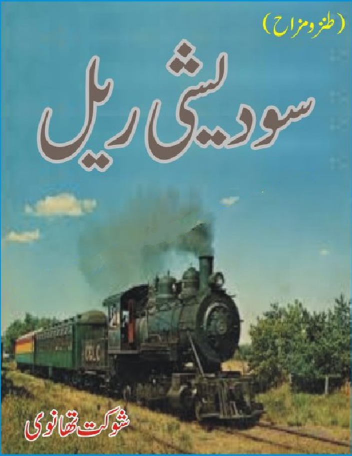

سودیشی ریل

(طنزومزاح)

شوکت تھانوی

باب 1

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا‘ مگر لاکھ کچھ بھی ہو ہمارے سینہ میں دل اور دل میں آزادی وطن کا جذبہ موجود تھا اور ”بندے ماترم“ کے نعروں پر تمام جسم کے رونگٹے غیر ارادی طور پر ہمیشہ کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ خواہ ہم جسم پر سودیشی کپڑا پہنے ہوں یا بدیشی‘ پھر ان بندے ماترم کے نعروں میں بھی وہ بلا کی کشش ہے کہ اپنی طرف کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں خواہ ہم بیمار ہوں یا تیماردار‘ کسی ضروری کام سے جا رہے ہوں یا کسی عالم میں ہوں مگر جہاں کانوں میں یہ نعرہ گونجتا ہوا پہونچا‘ ہم تمام دنیا اور تمام کیفیات سے خالی الذہن ہو کر اسی کے ہو رہتے ہیں اور یہ نعرہ ایسا دامن کشاں ثابت ہوتا ہے کہ ہم دو عالم سے دست افشاں اسی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

آج بھی یہی ہوا کہ گو ہم پر سفر سوار تھا اور ضروریات سفر کو فراہم کرنے میں ہمہ تن محو تھے مگر عین امین آباد پارک کے چوراہے پر یہ نعرہ امین الدولہ پارک سے گونجتا ہوا ہمارے کانوں میں پہونچا اور ہم اس کو سنتے ہی اپنے جملہ حقوق اس کے نام محفوظ کر بیٹھے۔ چنانچہ جھپٹ کر ایک شناسا کی دوکان پر پہونچے حقہ کا نیچا‘ اصغر علی محمد علی کے یہاں کے تیل کی شیشیاں‘ تمباکو اور صراحیاں‘ دوکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ ”بھائی ابھی آتے ہیں ہم ذرا دیکھتے رہنا ان چیزوں کو“ اور سیدھے امین الدولہ پارک کے اس مجمع میں جو مواج سمندر کی طرح سانسیں لے رہا تھا‘ ہم بھی ایک قطرہ کی صورت میں شامل ہو گئے۔

اس مجمع کے عین وسط میں‘ ایک تخت پر ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر سے پیر تک کھدر بھنڈار بنے ہوئے تھے۔ سر پر گاندھی ٹوپی‘ داڑھی مونچھ سے فارغ البال‘ لمبا سا کھدر کا کرتا‘ اس کے نیچے کھدر کی دھوتی باندھے ہوئے چپل پہنے‘ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ آپ کا ایک ہاتھ کمر پر رکھا ہوا تھا تا کہ تقریری جھٹکوں سے کمر کو محفوظ رکھے اور دوسرا ہاتھ مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے‘ اس طرح حرکت میں لا رہے تھے گویا مجمع بینڈ بجانے والوں پر مشتمل ہے اور آپ بینڈ ماسٹر ہیں۔ آپ تقریر کرتے کرتے مشرق سے مغرب کی طرف گھوم جاتے تھے اور کبھی مغرب سے شمال کی طرف‘ کبھی بالکل آپ کا رخ ہماری طرف ہوتا تھا اور کبھی ایک دم گھوم کر ہم سے منہ موڑ لیتے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ کے الفاظ کبھی تو بالکل صاف سنائی دیتے تھے۔ کبھی دور کی آواز کی طرح اور اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ آپ کے لب سینما کی چھائیوں کی طرح ہلتے ہوئے نظر آتے تھے‘ مگر آواز غائب ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ ہماری طرف جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے‘ وہ غل مچانے میں اتر‘ دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر

معلوم ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ بھی ہوتا تھا کہ جب وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر تقریر کرتے تھے اس وقت بھی یہ معزز سامعین ذرا مشکل سے کچھ سننے دیتے تھے۔ ورنہ وہ بیچارے تو ہر طرف گھوم گھوم کر حصہ رسد، اپنے الفاظ چاروں طرف لٹا رہے تھے۔ پھر بھی ہم نے جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا۔ اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر یعنی ہندی بولتے بولتے کبھی اردو پر عنایت فرما کر، کبھی اردو میں، کبھی انگریزی میں، کبھی نثر میں اور کبھی نظم میں۔ کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر، آپ ایک ہی بات کو دہرائے جاتے تھے۔ مثلاً۔

”مترو اور سجنو، اب اس کا سمے نہیں۔ اس کا وقت گجر گیا کہ ہم ہم ایسی سبھا، ایسے جلسے، ایسی میٹنگیں کریں ان میں تجویزیں، رجولیوسن منجور کریں اور اور چپ چاپ گھر میں بیٹھ رہیں۔ اب آپ کو اپنا دیش، اپنا ملک، خود سنبھالنا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے (دوسری طرف گھوم گئے دور کی سی نہایت باریک آواز آئی) اپدیش، سنسار، کارنٹر (پھر ادھر گھومے) غلفت کو چھوڑ کر اٹھیے۔ ۳۱ دسمبر کے بعد، ہم کو ہمارا ملک، مہاتما جی دلوا دیں گے۔ سوراج، سورجیہ ہمارا پیدائشی حق تھا۔ وہ ہم کو مل رہا ہے (پھر گھومے) چرخہ، کھدر، سودیشی، جیل، برٹش گورنمنٹ، قومی جھنڈا، یونین جیک، پرارتھنا (چیرز کے بعد تقریر ختم)۔

دو گھنٹہ کی اس ہفت زبان تقریر کا مفہوم ہم صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ ۳۱ دسمبر کے بعد ہم کو سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انہوں نے کچھ کہا بھی نہ ہوگا۔

اور اگر کہا بھی ہوگا تو وہ اس سے زیادہ ضروری اور اہم نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا ہم اسی ۳۱ دسمبر کو سوراج مل جانے کے خیال میں مستغرق، مجمع کے مدوجزر میں تھپیڑے کھاتے ہوئے باہر آ گئے۔ دوکان پر سے اپنا سامان اٹھایا اور سیدھے گھر پہونچے۔ اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقہ بھرا اور آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے کہ اس لیے گاڑی کے وقت میں بھی ابھی پورے دو گھنٹہ کی دیر تھی۔ بہرحال ہم بالکل تیار ہو کر اس لیے بیٹھے تھے کہ وقت آتے ہی اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ شیروانی بھی پہنے ہوئے تھے۔

لکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کو سوراج کا مل جانا، دماغ میں چکر لگا رہا تھا اور اسی کے متعلق ہم غور کر رہے تھے کہ آخر یہ سورج کے لیے ۳۱ دسمبر کی تاریخ کیوں مقرر کی گئی ہے۔ حساب لگا کر دیکھا تو ۳۱ دسمبر کا دن کچھ ایسا مبارک بھی نہ تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ اس کے بعد یکم جنوری سے نیا سال شروع ہوتا تھا مگر جب سوراج کسی سے لینا نہیں بلکہ خود حاصل کرنا ہے، تو آخر اس کے لیے تاریخ کے تعین کی ضرورت ہی کیا تھی، اگر حکومت سوراج دے رہی ہوتی اور ہم اس سے لے رہے ہوتے، تو ایک بات بھی تھی کہ صاحب ۳۱ دسمبر کو

سوراج کا لین دین اس لیے ہوگا تا کہ نئے سال سے نیا کارخانہ شروع ہو لیکن جب حکومت کے دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا صرف ہم کو سوراج لینا تھا، تو آج کیوں نہیں لیا، اگر آج سوراج لیا گیا ہوتا تو ہم اپنی ریل میں سفر کرتے، نہ اس میں بدیشی گارڈ ہوتا، نہ فارن ڈرائیور، نہ انگلو انڈینس کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے، چاہے تھرڈ میں بیٹھتے، چاہے فرسٹ میں۔ ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ کلاس میں بٹھا کر، اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتے اور پھر اکڑ اکڑ کر سفر کرتے جس طرح آج کل انگریز سفر کرتے ہیں۔

ہم یہ سوچ ہی رہے تھے اور انہیں خیالات میں گم تھے کہ ایک دم سے کانوں میں پھر وہی ”بندے ماترم“ کی آواز آئی اور ہم گڑبڑا کر دوڑے گھر کے باہر، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بہت بڑا جلوس، جھنڈے اور جھنڈیوں سے سجا ہوا، گیس کی بتیوں سے منور ”بندے ماترم“ کے نعروں سے زمین اور آسمان کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے پہلے تو خود ہی اس جلوس کے معنی سمجھنے کی کوشش کی مگر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ایک آدہ صاحب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ”جھنڈا اونچا رہے ہمارا“ اس جوش و خروش سے گا رہے تھے۔ کہ انہوں نے نہ ہمارا سوال سنا نہ ہم کو کوئی جواب دیا آخر ایک صاحب سے جو ذرا خاموش جلوس کے ساتھ جا رہے تھے۔ ہم نے پوچھا۔

”کیوں صاحب یہ بات کیا ہے؟“

جواب دیا۔ ”یہ جلوس ہے کانگریس کا۔“

ہم نے کہا۔ ”وہ تو میں سمجھا مگر آخر کس بات کا ہے۔“ انہوں نے ذرا ٹھہر کر آنکھیں پھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”کہ کیا آپ سو رہے تھے خبر نہیں کہ سوراج مل گیا ہم کو۔“

ہم نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔ ”سوراج“

انہوں نے روانہ ہوتے ہوئے غالباً ہم کو بے وقوف سمجھ کر تمسخر سے کہا۔ ”جی ہاں جناب سوراج۔ سوراج، سوراجیہ۔“

وہ تو روانہ ہو گئے ہم نے اپنے دل میں کہا کہ واہ بھئی واہ یہ بھی ایک ہی رہی، دعا قبول ہوئی ہماری اور سوراج ملا ان لوگوں کو۔ حالانکہ حقدار ہم تھے اور پھر سوچا کہ ہم اور یہ، کچھ غیر تھوڑی ہیں ان کو ملا یا ہم کو بات ایک ہی ہے۔ مگر واللہ ملا خوب سوراج۔ اگر اس وقت بادشاہت مانگتے تو ہم کو مل جاتی۔ دل کو کسی طرح سوراج ملنے کا یقین نہ آتا تھا۔ مگر جلوس ابھی تک نظروں کے سامنے تھا، آخر کار واقعات اور مشاہدہ نے غلط فہمی کو دور کیا اور ہم نے اس پر یقین کر کے کہ واقعی سوراج مل گیا اور ہر شخص سے یہی چرچا سن کر پہلی مرتبہ،

ایک آزاد اور خود مختار انسان کی طرح اکڑ کر سانس لی۔ دل تو چاہتا تھا کہ اسی وقت امپیریل بنک جا کر کہیں کہ حوالہ کرو تمام خزانہ ہم کو اور نکل جاؤ تم لوگ یہاں سے۔ مگر چونکہ اب سوراج مل جانے کے بعد ایک قسم کا استغنا پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے سفر بھی درپیش تھا۔ لہٰذا یہ ارادہ اور اسی قسم کی سینکڑوں امنگوں کو ملتوی کر کے ہم گھر میں چلے گئے تا کہ اسٹیشن روانہ ہو جائیں اور اس لیے کہ اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ گھر سے سب سامان لیا اور اور سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

اسٹیشن پہنچ کر سب سے پہلا مرحلہ ٹکٹ کا خریدنا تھا۔ لہٰذا ہم نے سامان تانگہ والے سے اتروا کر وہیں رکھ دیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر اور اس کی سلاخوں سے جھانک کر کہا۔

’’کانپور سیکنڈ کلاس سنگل جرنی۔‘‘

بکنگ کلرک صاحب نے اپنی ناک کی پھننگی پر لگی ہوئی عینک کے اندر سے ہم کو غور سے دیکھا اور چند سیکنڈ تک ہمارا مطالعہ کرنے کے بعد کہنے لگے۔

’’کانپور سیکنڈ کلاس ٹکٹ لیجیے گا۔‘‘

ہم نے کہا ’’جی ہاں‘‘

بابو جی نے اپنے منہ کے اندر کا پان جگالی کے انداز سے دو تین مرتبہ چبا کر ایک عجیب ادائے دلبری کے ساتھ کہا۔

’’اچھا تو میں ایک ہی بات کہہ دوں۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’کیا مطلب آپ کا؟‘‘

کہنے لگے۔ ’’مطلب یہ کہ کیوں مول تول کیا جائے۔‘‘

ہم بابو جی کے اس مزاح پر ہنس دیئے۔ مگر ہمارے اس ہنسنے کے باوجود بابو جی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

’’جناب سنئے واجبی بات یہ ہے کہ تین روپے ہوئے اس سے کم میں نہ ملے گا۔

اب تو ہم کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تو دو روپے کچھ آنے کرایہ تھا اور حال ہی میں ریلوے نے ٹکٹ کے داموں میں تخفیف کا اعلان کیا تھا۔ اگر تخفیف اضافہ کو کہتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ یہ قصہ کیا ہے ہم نے بابو سے کہا۔

’’تین روپے کیوں کر ہوئے صاحب ابھی کچھ دن پہلے دو روپے کچھ آنے کرایہ تھا اور حال ہی میں تخفیف ہوئی ہے۔ آپ تین روپے کیونکر مانگ رہے ہیں؟ مجھ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس سنگل جرنی چاہیے۔‘‘

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر کہا۔ ’’میں بہرا نہیں ہوں سن لیا کہ آپ کو کانپور سیکنڈ کلاس سنگل جرنی چاہیے ہے مگر اسی کے میں تین روپیہ سے کوڑی کم نہ لوں گا۔‘‘

ہم نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ ’’مگر بابو صاحب ابھی ایک ہفتہ قبل تو دام بہت کم تھے اس سے جو آپ فرما رہے ہیں۔‘‘

بابو جی نے کہا۔ ’’وہ بات جانے دیجیے۔ اب دیش ہمارا ہے۔ ریل ہماری ہے۔ ٹکٹ ہمارے ہیں ہم کو سوراجیہ مل گیا ہے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’اچھا تو یہ کہیے کہ ریل کو بھی سوراجیہ مل گیا ہے۔ اچھا خیر ٹکٹ دلوایئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔‘‘

بابو جی نے ہاتھ پھیلا کر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ’’لایئے تین روپے اور ٹکٹ لے لیجیے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’صاحب ذرا حساب لگا کر دیکھیے۔ تین روپے تو میں بغیر سوچے سمجھے نہ دوں گا۔‘‘

بابو جی نے کہا۔ ’’اچھا آپ ایک آنہ کم ہی دے دیجیے۔ آپ کی وجہ سے نقصان ہی اٹھا لیں گے۔‘‘

اب تو ہم کو ہنسی کے ساتھ غصہ اور غصہ کے ساتھ ہنسی بھی شروع ہو گئی۔ ہنسی آ رہی تھی اور اس مول تول پر اور غصہ آ رہا تھا تضیع اوقات پر۔ اس کے علاوہ ٹرین کے چھوٹ جانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ مول تول کی اس لغویت میں ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے لہٰذا یہ ارادہ کر کے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کریں گے۔ ہم نے بکنگ آفس کی کھڑکی چھوڑ دی اور چلے اسٹیشن کی طرف ہم کو جاتا دیکھ کر بابو جی نے آواز دی۔ ’’اچھا ادھر آیئے۔‘‘

ہم نے جاتے ہوئے کہا بس بخشئے۔ جناب آپ کو دل لگی سوجھی ہے اور یہاں گاڑی چھوٹ رہی ہے۔

بابو جی نے ہم کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گھبرا کر کہنا شروع کیا۔ ’’سنئے تو مہربان اجی سنئے تو سہی نہ آپ کی بات نہ ہماری پونے تین روپے دے دیجیے۔ اچھا ڈھائی روپے دے دیجیے۔‘‘

ہم نے دور سے کہا۔ ’’مجھے ٹکٹ چاہیے ہے نہ مولی یا گاجر نہیں چاہیے۔ آپ نے تو ترکاریوں والا مول تول شروع کر دیا۔‘‘

بابو جی نے پھر آواز دی۔ ’’دو روپے دیجیے گا یا نہیں؟ اچھا آیئے ڈیڑھ روپیہ دے دیجیے۔ اجی دیکھئے تو اتنا سستا ٹکٹ آپ کو نہیں مل سکتا۔ اچھا لیجیے ایک روپیہ میں لیتے جایئے۔‘‘

ہم نے جب ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس مضحکہ خیز انداز سے گرتے ہوئے دیکھا تو دور ہی سے بطور مذاق کہہ دیا کہ ’’بارہ آنے لو گے اس ٹکٹ کے یا نہیں؟‘‘

ہم سمجھے تھے بابو جی ہمارے اس مذاق پر ناچ ہی تو جائیں گے مگر کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے

لگے کہ ”لایئے صاحب لایئے بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی ہو رہی ہے۔“

ہم نے بارہ آنے پیسہ گن کر بابو جی کے حوالہ کر دیئے اور ان سے ٹکٹ لے لیا مگر یہ ٹکٹ عجیب وغریب تھا۔ بابو جی نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ”درجہ دوم کانپور“ لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے ہم نے اس ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور پھر بابو جی کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو جی تھے ذرا آدمی قیافہ شناس‘ متبسم ہو کر بولے۔ ”صاحب بات یہ ہے کہ رات کو تو سوراجیہ ملنے کی ڈگی پٹی ہے۔ ابھی نہ تو ٹکٹ چھپے ہیں اور نہ کوئی اور انتظام ہوا ہے۔ دو ایک دن میں سب انتظام ہو جائے گا مگر آپ کو اس سے کیا مطلب‘ آپ کو تو سفر کرنا ہے‘ آپ سفر کیجئے۔“

بابو جی کی اس تسلی کے بعد بھی ہم اس الجھن میں مبتلا رہے کہ جس ٹکٹ پر نہ تاریخ ہو‘ نہ کرایہ‘ نہ فاصلہ درج ہو۔ نہ روانگی کا مقام‘ وہ ٹکٹ کیونکر کام دے سکتا ہے۔ مگر ہم نے سوچا کہ جیسے بارہ آنے ہم نے دیئے ہیں‘ ویسا ہی ٹکٹ ہم کو ملا ہے۔

یہ سوچ کر کہ یا تو گئے بارہ آنے یا پھر کچھ فائدہ میں ہم رہیں گے‘ ہم قلی کو ڈھونڈتے ہوئے اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے۔

اسٹیشن یقیناً وہی چارباغ لکھنؤ کا اسٹیشن تھا۔ جس سے عمر بھر ہم نے سفر کیا تھا۔ مگر آج اس کا نقشہ ہی دوسرا تھا۔ سامان سب کچھ وہی تھا جو آج سے پہلے ہم دیکھ چکے تھے۔ مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی تھی۔ یا الٹا باندھ کر لٹکا دیا تھا۔ وہی گھڑی تھی اور وہی گھڑیال‘ مگر گھڑی میں ہنوز ۱۰ بجنے میں ۲۵ منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ وہیلر بک اسٹال پر ایک کچالو والا دہی بڑے کے دونے بنا رہا تھا۔ انکوائری آفس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ مگر اس کے سامنے ہی ایک چپل والا اپنی دکان لگائے ہوئے تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے پر کانگریسی جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اس کے باہر ایک والنٹیر بڑا سا ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ مگر جس تلاش میں ہم آئے تھے اس میں قطعاً ناکام تھے۔ یعنی قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا اور ہماری سمجھ میں قطعاً نہ آتا تھا کہ آخر اسباب‘ ٹرین تک کیونکر پہونچائیں۔ آخر بہ مشکل تمام ایک قلی ملا‘ لیکن جیسے ہی ہم نے اس سے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے چین بچیں ہو کر جواب دیا۔

”اندھے ہو گئے ہو‘ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر۔“

ہم ”معاف کیجئے گا“ کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے اور ان اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھنے کے بعد‘ سوچنے لگے کہ یا اللہ یہ کی انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے۔ اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں۔ تو قلی کس صورت کے ہوں گے۔ بہرحال ہم نے پھر کسی قلی سے خواہ وہ قلی ہی کیوں نہ ہو۔

اسباب اٹھانے کی فرمائش اس ڈر سے نہیں کی کہ مبادہ یہ اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ یا ٹریفک انسپکٹر یا کمرشل منیجر یا ایجنٹ وغیرہ نہ ثابت ہو اور ہماری شامت آ جائے۔ لہٰذا ہم نے خود ہی اپنا اسباب اٹھایا اور دو تین مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس تک پہنچایا۔

اس سیکنڈ کلاس میں پہلے ہی بیٹھے ایک جنٹلمین‘ چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر‘ جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور لہٰذا سب سے پہلے ہم نے ان ہی چلم پینے والے شریک سفر سے دریافت کیا‘ جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے یہی جواب دیا کہ۔

”کا جانی بھیا ہم کا ناہیں مولوم“ یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے ان سے بھلا کیا معلوم ہوتا مجبوراً ہم خود پلیٹ فارم پر آئے اور متعدد آدمیوں سے اس باب میں تحقیقات کرنے کے بعد جو عجیب وغریب بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہو گئے تو وہاں جائے گی‘ ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہو گی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے ابھی تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا جانے ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔ ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

”لیکن یہ فیصلہ کب ہو گا؟“

جواب ملا کہ ”جب گاڑی بھر جائے گی۔ اس وقت یہ فیصلہ ہو سکتا ہے۔“

ہم نے کہا ”مگر ٹرین کا وقت تو ہو چکا ہے؟“

ایک صاحب نے قائل کرنے کے لیے سنجیدگی اور تدبر کے ساتھ کہا۔

”صاحب وقت ہو جایا کرے مگر یہ تو سوچئے کہ جب تک ٹرین بھر نہ جائے کیونکہ چھوڑی جا سکتی ہے۔ کیا خالی ٹرین چھوڑ دی جائے۔“

اب ہم راضی برضا ہو کر گردن لٹکائے ہوئے ان حضرات کے پاس سے چلے آئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ کفران نعمت کے مرتکب ہوتے تھے کیونکہ یہ تو ہماری ہی تمناؤں کا نتیجہ تھا اور ہماری ہی دعائیں باب قبول سے‘ یہ نعمت ہمارے لیے لائی تھیں۔ البتہ دل ہی دل میں یہ ضرور کہہ رہے تھے کہ ایسی بے قاعدگی تو لاریوں میں بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ ریل کے بجائے لاریوں میں سفر کرنے والوں کو ہم نے ہمیشہ کچھ یونہی سا سمجھا ہے کہ اول تو وہ لاریوں میں تربوز اور کدو کی طرح ایک کے اوپر ایک لد کر سفر کرتے ہیں۔ دوسرے ان کا کوئی پروگرام ہی مرتب نہیں ہوتا۔ جب لاری بھر جاتی ہے اور لاری کے مالک کی مرضی کے مطابق بھر جاتی ہے اس وقت وہ روانہ ہوتی ہے۔ خواہ اس میں صبح سے شام ہو جائے۔ پھر اگر راستہ میں پٹرول ختم ہو گیا‘ تو تمام

سواریاں لاری کو ڈھکیل کر چلتی ہیں۔ گویا سواری کو اپنے اوپر سوار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر موٹر ڈرائیور صاحب نے ذرا بھی ادھر سے ادھر گھما دیا تو وہی لاری موت کے گھاٹ بھی اتار دیا کرتی ہے اور کسی دوسری لاری یا کسی بیل گاڑی وغیرہ سے ٹکرا جانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مختصر یہ کہ لاری پر سفر کرنا خصوصا ان مقامات پر جہاں ریل بھی جاتی ہو سوائے حماقت کے ہمارے نزدیک اور کچھ نہیں مگر آج تو اس ریل کا انتظام لاری کے انتظام کو بھی مات کیے دیتا تھا۔ بلکہ ہم لاری پر جس حد تک معترض ہوئے تھے اس پر آج اس ریل کی حرکتیں دیکھ کر حد درجہ نادم ہو رہے تھے اور گویا دل ہی دل میں لاری سے معذرت خواہ تھے کہ اے محترمہ ہم نے تیری بہت تذلیل کی ہے تو ہم کو معاف کر دے۔

اس وقت ہم کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی اپنے ڈبے میں بیٹھ کر، کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر، کبھی انجن کو مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک حد نظر تک ڈھونڈ کر، کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ کر کے وقت کاٹنے لگے۔

گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک اور ایک سے ۲ بجے مگر نہ اسٹیشن کی گھڑی کی سوائی اپنی جگہ سے ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، البتہ گھڑی کی جگہ پر ہمارا دل اختلاج کی کیفیت کے ماتحت چل رہا تھا اور ٹرین کے بجائے ہم خود پلیٹ فارم پر شنٹنگ کر رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ایک کھدر پوش والنٹیر نما انسان نے پلیٹ فارم پر آ کر چیخنا شروع کیا کہ۔

"بیٹھنے والے مسافر و بیٹھو، گاڑی چھوٹتی ہے۔"

ہم نے یہ مژدہ جانفزا سنتے ہی، مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈا پھر مغرب کی طرف، مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بغیر انجن کے ٹرین کیونکر چھوٹ رہی ہے۔ مگر شک اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ یہ اعلان ان ہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کے حکم سے ہوا تھا جن کو ہم پہلے قلی سمجھے تھے۔ بہر حال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم تعمیل حکم میں اپنے ڈبہ کے اندر آ گئے اور ہمارے بیٹھتے ہی، اسی سیکنڈ کلاس کے اندر، دو تین درجن لٹھ بند گنوار گھس آئے۔ ہم نے ان سے لاکھ لاکھ کہا۔ "یہ سیکنڈ کلاس ہے آگے جاؤ۔ ارے بھئی یہ سیکنڈ کلاس ہے۔ اماں سیکنڈ کلاس ہے سیکنڈ کلاس" مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ یہی کہتے رہے کہ "ہم ہو جانت ہیں ڈیوڑہا ہے ہم ہو ٹکس لیا ہے ڈیوڑہا کیار" مجبوراً ہم کو اس گنوردل کے سامنے چپ ہو جانا پڑا، لیکن ارادہ کیا کہ پلیٹ فارم پر جا کر کسی ذمہ دار شخص سے کہہ دیں کہ یہ لوگ سیکنڈ کلاس میں گھس آئے ہیں۔ چنانچہ پہلے تو ہم نے گارڈ کو تلاش کیا مگر جب گارڈ کا پتہ نہ ملا تو مجبوراً ان ہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاح سے، جن کو ہم قلی سمجھے تھے ہم نے عرض کیا مگر انہوں نے خالص سودیشی شان سے کہا "بیٹھیے جا کر اپنی جگہ پر، سب ہندوستانی برابر ہیں سب بھائی ہیں۔ سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں، کوئی کسی سے چھوٹا یا بڑا

نہیں ہے، جن کو آپ گنوار کہہ رہے ہیں وہی آپ کے ان داتا ہیں، آپ کے لیے کھیتی باڑی کر کے اناج پیدا کرتے ہیں، نہیں تو آپ بھوکوں مر جائیں، اب سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے اور سب کو برابر سمجھے جا کر بیٹھیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔"

ہم یہ کھری کھری تقریر سن کر اپنا سامنہ لیے ہوئے واپس آ گئے۔ اب جو آ کر دیکھتے ہیں تو یہاں بیٹھنے تک کی جگہ نہیں، ایک کے اوپر ایک لدا ہوا ہے۔ سیکنڈ کلاس کے دبیز گدوں پر پانچ پانچ سیر کے جوتے رکھے ہوئے یہ ان داتا لوگ بیٹھے تھے اور ایک عجیب بحث ان سب کے درمیان چھڑی ہوئی تھی۔ جو معلوم ہوتا کہ عنقریب جنگ عظیم کی صورت میں تبدیل ہو جائے گی۔ قصہ یہ تھا کہ واقعی ان سب نے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے یا ان کو بکنگ آفس کے کلرک صاحب نے اسی درجہ کے ٹکٹ دے دیئے تھے۔ اس لیے کہ سب کے پاس وہی کاغذ کے پرزے تھے، جیسا کہ ایک ہمارے پاس تھا۔ مگر لطیفہ یہ تھا کہ کسی سے تو بارہ آنے لیے گئے تھے۔ کسی سے چودہ آنے، کسی سے روپیہ اور کسی سے سوا روپیہ، لہٰذا یہ سب حضرات اپنے اپنے دام بتا رہے تھے اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اس لیے کہ ایک درجہ ٹکٹ ہر ایک کے پاس یکساں داموں کا ہونا چاہیے۔ ہم اس دلچسپ بحث کو عرصہ تک سنتے رہے، اس لیے کہ ان سب سے علیحدہ، غسل خانہ کھول کر اس کے کموڈ پر ہم نے اپنی لیے جگہ پیدا کر لی تھی۔ ایک گھنٹہ تک ہم نے ان سیکنڈ کلاس کے معزز مسافروں کی چیخ پکار، گالم گلوچ "تو تو میں میں، اور مناظرہ نما گفتگو سے دلچسپی لی۔ اس کے بعد پلیٹ فارم پر آئے کہ دیکھیں یہ گاڑی چھوٹے گی بھی یا نہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ٹرین میں انجن لگایا جا رہا تھا۔

اور مزید شکر یہ ہے کہ کانپور ہی کی جانب انجن لگ رہا تھا۔ ہم خدا کا شکر ادا کر کے ٹرین میں آ گئے اور اس اطمینان کے ساتھ بیٹھ رہے کہ اب تو بہر حال ٹرین چھوٹ ہی جائے گی۔ مگر اب کی مرتبہ بھی ہم کو تیس چالیس منٹ تک یونہی بیٹھنا پڑا۔ آخر کار ہم نے پلیٹ فارم پر پھر اتر کر پوچھا کہ "آخر گاڑی چھوٹنے میں کیا دیر ہے۔" ایک صاحب نے جو ہماری ہی طرح مضطرب معلوم ہوتے تھے جواب دیا کہ۔

"کیا عرض کیا جائے جناب، ناک میں دم ہو گیا ہے۔ اگر ضروری کام نہ ہوتا تو لعنت بھیج کر اس ٹرین پر، میں تو کب کا واپس چلا گیا ہوتا۔ اب معلوم ہوا کہ سیکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ آ جائیں تو گاڑی چھوڑی جائے۔ ۱۲ بجے آنے کا کہلا بھیجا تھا، مگر اب تک نہیں آئے۔"

ہم نے کہا۔ "صاح اب تو میں بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ کانپور جاؤں یا نہ جاؤں، کام بہت ضروری ہے، اس لیے جانا بہت اہمیت

رکھتا ہے' ٹرین چھوٹتی نہیں' اس لیے حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں۔ بہر حال اب جو فیصلہ کیجئے۔'' ان صاحب نے کہا۔ ''پہلے تو آپ اور میں' دونوں ایک ہی جگہ پر بیٹھ جائیں پھر غور کریں گے۔''

ہم نے کہا۔ ''میرے پاس تو آپ غالباً بیٹھنا گوارہ نہ کریں گے اس لیے کہ مجھ کو اس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر اس کے کموڈ پر جگہ ملی ہے۔''

ان صاحب نے کہا۔ ''اور صاحب میرا یہ حال ہے کہ میرا اسباب تو ضرور فرسٹ کلاس میں رکھا ہے مگر میرے لیے کہیں جگہ نہیں' چلئے کوئی اور جگہ دیکھیں۔''

آخر کار ہم دونوں نے مل کر ایک نہایت ہی پر سکون جگہ ڈھونڈ لی یعنی وہ ڈبہ جس کو سوراج ملنے سے پہلے ریسٹوران کار کہتے تھے اور جو آج بلا وجہ خالی پڑا ہوا تھا ہم دونوں نے اپنا سامان لا کر چپکے سے اسی میں رکھ دیا' چپکے سے اس لیے نہیں کہ کوئی ریلوے آفیسر دیکھ لے گا۔ بلکہ اس لیے کہ کوئی اور مسافر دیکھ نہ لے۔ اس پر سکون جگہ پر بیٹھ کر ہم دونوں کچھ سوچنے ہی والے تھے کہ ''بندے ماترم'' کے فلک شگاف نعروں نے ہم دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر سے اچھال دیا۔ معلوم ہوا کہ سیکریٹری صاحب ٹاؤن کاگریس کمیٹی آ گئے۔ ہم نے بھی اس ریسٹوران کار کی جالی سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع کے وسط میں وہی کھدر پوش لیڈر صاحب نظر آئے۔ جن کی تقریر رات ہم سن چکے تھے اور جن کی تقریر نے اگر سچ پوچھئے تو سوراج دلوا دیا تھا۔ اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی ٹاؤن کانگرس کمیٹی کے سیکریٹری ہیں۔ ان کے تشریف لاتے ہی' ہر ایک اپنے اپنے ڈبے میں گھس گیا اور انجن بھی سنسنانے لگا۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی دیر میں ایک کھدر پوش' چپل زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہی گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے پلیٹ فارم پر آتے ہی' کھدر کے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ' پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے کہ گویا پہلے غلطی سے سبز کے بجائے سرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجانے اور جھنڈی ہلانے کے بعد آپ غصہ میں سرخ ہو کر' انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں' جھنڈی دکھا رہا ہوں مگر نہ تو تمہارے کان سیٹی کی آواز سنتے ہیں نہ آنکھیں جھنڈی دیکھتی ہیں کہ ٹرین چھوڑو۔'' ڈرائیور نے بھی ان کے اس بیجا غصہ کا جواب انجن پر سے اتر کر کڑک کر دیا کہ ''صاحب آپ مجھ پر کیوں آنکھیں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہیں۔ دو گھنٹہ سے کلو فائر میں کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آؤ۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسہ کم یا زیادہ کا خیال نہ کرنا۔ مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے کہ کیا میں اپنے کو انجن کی بھٹی میں ڈال کر گاڑی چھوڑ دوں۔''

گارڈ صاحب' ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر ٹرین روکنے پر مجبور ہو گئے۔ اگر یہ گھوڑا گاڑی ہوتی تو گھوڑے بیچارے کو بغیر دانہ گھاس کے ہنٹر مار مار کر تھوڑی دور چلایا جا سکتا تھا۔ مگر یہ تھی ریلوے ٹرین' جس کا آہنی گھوڑا' کوئلہ کو اپنے لیے دانہ گھاس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا تھا اور بغیر کوئلہ کے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتا تھا اب بتائیے کہ ٹرین بھی تھی اور مسافر بھی' گارڈ صاحب بھی موجود تھے اور سیکریٹری صاحب ٹاؤن کانگرس کمیٹی بھی تشریف لے آئے تھے اور ڈرائیور بھی پا بر کاب تھا۔ مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے ان سب کا ہونا نہ ہونا سب یکساں بنا ہوا تھا۔ گویا اس وقت کوئلہ سب کچھ تھا اور اس کے مقابلہ میں نہ سیکریٹری صاحب ٹاؤن کانگرس کمیٹی کوئی چیز تھے اور نہ ڈرائیور صاحب کی کوئی حیثیت تھی' نہ گارڈ صاحب کو اس کے مقابلہ میں کوئی اہمیت حاصل تھی' نہ ان قلی نما اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاح کی کوئی وقعت تھی۔ اس وقت تو سب کچھ کوئلہ ہی تھا اور اسی کا انتظار اس شدت سے کیا جا رہا تھا کہ ہر مسافر اپنی جگہ پر قیس صفت بیٹھا ''لیلیٰ چارکول'' کے انتظار میں آنکھیں پھاڑے ہوئے' کلو فائر مین کی راہ دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کلو فائر مین' کوئلہ کا ایک بورا پیٹھ پر لادے ہانپتے ہانپتے آ پہنچے اور انجن کے سامنے بورا پیٹھ سے پلیٹ فارم پر گراتے ہوئے' اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان گھٹنا سہلا سہلا کر کہنے لگے۔

''آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں' تمام دوکانیں بند ہو گئیں کب کی' عیش باغ کے پھاٹک والی دوکان کے دوکان دار کو جگایا۔ تو اس نے نخرے شروع کر دیے۔ کسی طرح ڈھائی روپے من سے کم نہ کرتا تھا آخر کار رکاب گنج تک دوڑنا پڑا' وہاں کوئی ڈھائی روپے کہتا تھا کوئی دو روپے چھ آنے اور مجھ کو دیے گئے تھے صرف دو روپے' مجبوراً ایک دوکان دار کے ہاتھ پیر جوڑ کر' سوا دو روپے کے بھاؤ سے یہ کوئلہ لیا ہے اور چونی قرض کر آیا ہوں۔ راستہ بھر دوڑتے دوڑتے الگ ناک میں دم ہو گیا۔ ایک جگہ گر بھی گیا' تمام گھٹنے چھل کر رہ گئے۔ صاحب یہ کوئلہ ووئلہ دن سے منگا لیا کرو۔ واہ۔''

ڈرائیور نے جلدی جلدی کوئلہ انجن میں ڈالا۔ انجن سنسنایا اور ڈرائیور نے سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی' اس لیے کہ گارڈ سے اب مشورہ کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ڈیڑھ گھنٹہ قبل سیٹی بھی بجا چکے تھے اور جھنڈی بھی دکھا دی تھی۔ لہٰذا اب ان کی سیٹی اور جھنڈی کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ گاڑی رینگی' مگر گاڑی ابھی چھوٹی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔ ''گاڑی روکو۔ گاڑی روک' گارڈ صاحب رہ گئے۔'' مجبوراً گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو لے کر روانہ ہوئی۔ مگر ابھی مشکل سے چار پانچ گز چلی ہو گی کہ گارڈ صاحب نے گاڑی کو اپنی جھنڈیوں کے ڈنڈوں سے بجا بجا کر چیخنا شروع کیا کہ ''ارے لائن کلیر بھی لے لیا ہے

یانہیں‘‘ تھوڑی دیر کے بعد ڈرائیور نے پھر گاڑی روک دیں اور پکار کر گارڈ صاحب سے پوچھا۔

’’کیا بات ہے کیا کہہ رہے تھے آپ کچھ سنائی نہیں دیا۔‘‘

گارڈ صاحب نے بھی چیخ کر کہا۔ ’’ارے یہ کہ لائن کلیر بھی لے لیا تھا‘ لائن کلیر؟‘‘

ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا کہ ’’لے لیا تھا‘ لے لیا تھا۔‘‘

گارڈ صاحب نے اس طرف سے اطمینان فرما کر کہا۔ ’’اچھا تو پھر چھوڑو گاڑی‘ میں بجاتا ہوں سیٹی اور لو یہ دیکھو میں جھنڈی دکھا رہا ہوں۔‘‘

گارڈ صاح نے جھنڈی دکھا کر سیٹی بجادی‘ مگر ڈرائیور اس سے قبل ٹرین چھوڑ چکا تھا اور اب گویا ٹرین چل رہی تھی اور ہم سفر کر رہے تھے۔ مگر اس وقت گاڑی کی رفتار ایک عجیب عقدہ لاینحل بنی ہوئی تھی اور ہم مسلسل غور کر رہے تھے کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس‘ اس لیے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے۔ بلکہ اب بھی اگر شرط باندھ کر دوڑیں تو اس گاڑی سے قبل کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس کی رفتار میں کبھی تو ’’خراماں خراماں‘‘ والا انداز دلبری پیدا ہو جاتا تھا۔ کبھی ’’آہستہ خرامی‘‘ کے جواہر دکھانے لگتی تھی اور کبھی اس کی رفتار اس قدر غیر محسوس ہو جاتی تھی کہ ’’مخرام‘‘ کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے اپنے شریک سفر سے پوچھا۔

’’کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس؟‘‘

وہ غالباً ہم سے بھی زیادہ زندگی سے بیزار بیٹھے ہوئے تھے جل کر کہنے لگے۔ ’’ارے صاحب خدا کا شکر ادا کیجئے کہ یہ گاڑی ہے۔ آپ میل اور ایکسپریس لیے پھر رہے ہیں‘ اگر نہ چلتی یہ گاڑی‘ تو آپ کیا کر لیتے۔‘‘

ہم اس جواب پر خاموش ہو رہے اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر سیر کرنے لگے۔ مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ مسافر ٹرین سے نہایت اطمینان کے ساتھ اترتے تھے اور پھر اس سے بھی زیادہ اطمینان کے ساتھ پیشاب بمعہ استنجہ وغیرہ کے‘ کر کے چہل قدمی کرتے ہوئے ٹرین میں سوار ہو جاتے تھے۔ راستہ میں نئے‘ مسافر تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلہ پر برابر مل رہے تھے اور ٹرین میں سوار ہوتے جاتے تھے۔ ہم اس منظر سے لطف اٹھا رہے تھے کہ یکا یک ہم نے عالم باغ کا بازار دیکھ کر ایک مرتبہ زور سے کہا۔ ’’اے یہ کیا؟‘‘

ہمارے شریک سفر نے کہا۔ ’’کیا ہوا‘ خیریت تو ہے؟‘‘

ہم نے گھبرا کر کہا۔ ’’یہ ٹرین تو بریلی‘ سہارنپور‘ لاہور‘ پشاور‘ درہ خیبر‘ کابل وغیرہ کی طرف جارہی ہے کانپور سے کیا مطلب؟‘‘

ہمارے شریک سفر بھی اب تو ٹپٹائے اور گھبرا کر بولے۔ ’’وہ کیسے؟‘‘

ہم نے کہا۔ ’’یہ دیکھئے عالم باغ ہے وہ سامنے عالم نگر کا بازار ہے اور اس کے آگے عالم نگر اسٹیشن‘ یہ راستہ کانپور کا کیونکر ہو سکتا ہے۔‘‘

ہمارے شریک سفر نے کہا۔ ’’تو پھر آپ نے کیوں کہا تھا کہ کان پور جارہے ہیں آپ‘‘ ہم نے کہا ’’واہ خصت واہ‘ کیا صرف میں ہی نے یہ کہا تھا آپ نے بھی تو یہی ارشاد فرمایا تھا۔‘‘

شریک سفر نے کہا ’’غالباً ڈرائیور راستہ بھول گیا۔‘‘

ہم نے کہا ’’یا راستہ میں اس طرف کے مسافر زیادہ ہو گئے۔‘‘

شریک سفر نے کہا۔ ’’مگر تحقیقات تو کرنا چاہئے اس کی۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’ضرور کیجئے تحقیقات کون منع کرتا ہے۔‘‘

شریک سفر نے کہا۔ ’’اتریئے ٹرین سے چل کر ڈرائیور سے پوچھ آئیں۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’نہیں صاح ممکن ہے کہ اسی دوران میں غلطی سے اسپیڈ تیز ہو جائے اور ہم سب۔

کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

بن کر اس جگہ رہ جائیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خطرہ کی زنجیر کھینچی جائے۔‘‘

شریک سفر نے اس تجویز کو پسند کر کے زنجیر کھینچ لی اور کھینچے ہوئے کھڑے رہے۔ مگر ٹرین نہ آج رکتی ہے نہ کل آخر ہم نے تھوڑی دیر تک ٹرین کے رکنے کا انتظار کرنے کے بعد ان سے کہا۔ ’’جناب ذرا زور سے کھینچئے۔‘‘

شریک سفر نے کہا۔ ’’بھائی پوری طاقت سے کھینچے ہوا ہوں اور زیادہ زور کی ضرورت ہے تو تم بھی ہاتھ لگا دو۔‘‘ ہم بھی بڑھ کر زنجیر میں لٹک گئے اور دونوں نے مل کر اس زور سے اس کو گھسیٹا کہ وہ ٹوٹ کر ہمارے ہاتھ میں آ گئی اور ہم دونوں اس کے جھٹکے میں تلے اوپر اس طرح گرے کہ شریک سفر ہمارا گاؤ تکیہ بنے ہوئے تھے اور ہم ان کو اس طرح ٹیکے ہوئے تشریف فرما تھے۔ گویا خاندانی رئیس ہیں‘ صرف پیچوان کی کسر ہے۔ مگر ٹرین اس کے بعد بھی نہ رکنا تھی نہ رکی۔ آخر ہم لوگ اپنے کپڑے جھاڑ کر اس ارادہ سے اٹھے کہ زنجیر سے یہ ٹرین نہیں رکتی ہے‘ تو خود اتر کر ڈرائیور صاحب سے عرض کریں کہ از راہ غریب نوازی یہ بتا دیجئے کہ کانپور کا یہ کون سا راستہ جناب نے دریافت فرمایا ہے جو براہ عالم نگر ہو۔ ہم یہ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ٹرین خود ہی ایک جھٹکے سے ساتھ ٹھہر

گئی۔ اب جو ہم دیکھتے ہیں تو عالم نگر کا اسٹیشن تھا۔ ٹرین کے ٹھہرتے ہی وہ مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے نکل آئے، جو ہماری طرح اس راستہ کی تبدیلی سے پریشان تھے۔

خود گارڈ صاحب بھی حیران و پریشان، ڈرائیور کی طرف جھپٹے اور اتنے میں اسٹیشن ماسٹر عالم نگر بھی اپنے دولت کدہ سے دھوتی باندھے جنیو درست کرتے ہوئے کھڑاؤں پہنے دتوں کرتے آ پہنچے گارڈ نے ڈرائیور کو دیکھتے ہی کہا۔

’’یہ آپ کانپور جا رہے ہیں؟‘‘

ڈرائیور نے کہا۔ ’’صاحب میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں نیا آدمی ہوں، راستہ سے واقف نہیں، لکھنؤ سے جب چلا ہوں تو کانپور کی اور یہ پٹری اس قدر قریب قریب بچھی ہوئی تھیں کہ غلطی سے اس پٹری پر انجن آ گیا اور مجھ کو خیال ہی نہ رہا۔ بات یہ ہے کہ اگر پٹری پر لکھا ہوتا کہ یہ عالم نگر کی پٹری ہے اور یہ کانپور کی، تو یہ غلطی نہ ہوتی۔‘‘

ڈرائیور نے اپنا بیان ختم ہی کیا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر عالم نگر نے کہا۔ ’’مگر کیا آپ کی سمجھ میں راستہ بھی نہ آیا۔‘‘

ڈرائیور نے کہا ’’اسٹیشن ماسٹری کرنا دوسری چیز ہے اور گاڑی چلانا دوسری چیز، اعتراض تو سب ہی کر سکتے ہیں۔ مگر ذرا انجن میں بیٹھ کر گاڑی چلایئے، تو میں پوچھوں گا کہ راستہ سمجھ میں آ رہا ہے یا نہیں؟‘‘

گارڈ نے ترشی سے کہا۔ ’’اپنی غلطی نہیں مانتے اور بے کار بحث کر رہے ہو، کیا تم کو یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ یہ عالم نگر کا راستہ ہے۔‘‘

ڈرائیور نے کہا ’’آپ بے کار خفا ہو رہے ہیں ابھی تکل تک تو میں والنٹیر تھا مجھے کیا معلوم کہ ریل کون سی پٹری کہاں گئی ہے۔ البتہ اگر میں قومی نعرہ بلند کرنے میں غلطی کروں یا قومی ترانہ غلط گاؤں، تو آپ کہہ سکتے ہیں، مگر انجن چلانے کا اتفاق تو آج ہی ہوا ہے وہ بھی اگر کلو فائر مین نہ بتائے تو آگے کے بجائے میں پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دوں۔‘‘

گارڈ نے کہا۔ ’’تو کیا کلو فائر مین نے بھی نہیں بتایا کہ راستہ غلط ہے۔‘‘

ڈرائیور نے کہا ’’جب ٹرین چل دی اور اس نے مجھ کو بتا دیا کہ اس طرح انجن چلتا ہے اور اس طرح رکتا ہے تو میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اچھا اب تم ایک نیند سو لو۔ وہ بے چارہ سو رہا تھا۔ جاگا ہوا بہت تھا۔‘‘

گارڈ نے کہا۔ ’’تو اب بتایئے کہ میں اپنی بوٹیاں نوچوں یا سر پھوڑوں‘ مسافروں میں سے پکار کر کسی نے کہا۔ ’’دونوں باتیں مناسب ہیں۔‘‘

اور پلیٹ فارم پر ایک ایسا قہقہہ بلند ہوا کہ گارڈ صاحب مارے غصہ کے اور بھی ناچ گئے مگر وہ تو کہئے کہ عین اسی وقت سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی اپنی جگہ سے اٹھ کر بغرض تحقیقات تشریف لے آئے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی گارڈ نے اپنی طرف ڈرائیور نے اپنی طرف، مسافروں نے اپنی طرف اور اسٹیشن ماسٹر عالم نگر نے اپنی طرف ان کو کھینچنا شروع کیا۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے اور ان کی کوئی نہ سنتا تھا، آخر انہوں نے ہاتھ جوڑ کر با آواز بلند کہا۔ ’’شانتی شانتی‘‘ یہ سن کر بمشکل تمام لوگ چپ ہو گئے اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔

’’بھائیو! آج ہمارے راج کا پہلا دن ہے، ہم کو سیکھنے کے بعد راج کرنا آئے گا۔ ہم غلامی کرتے کرتے، راج کرنا بھول گئے ہیں۔ ابھی تو ایسی غلطیاں قدم قدم پر ہوں گی اور آپ ان کو برداشت کریں گے، آپ اس بد انتظامی پر ہنسئے نہیں۔ بلکہ سب مل کر اور اس کو اپنا کام سمجھ کر غلطیوں کو دور کرنے کے لیے کوشش کیجئے۔ یہ ٹرین کان پور کے بجائے اگر ادھر آ گئی تو کیا حرج ہوا۔ ابھی واپس ہو کر پھر کان پور روانہ ہو جائے گی۔ جو کچھ ہوا، وہ تو اب ہو ہی چکا۔ کوشش یہ کیجئے کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔‘‘

اسٹیشن ماسٹر عالم نگر نے کہا۔ ’’مہاشے جی اب آپ آ گئے ہیں تو اس اسٹیشن سے بھی جو سواریاں کان پور جانے والی ہوں ان کو لے لیجیے۔‘‘

سیکریٹری صاحب نے گارڈ صاح کی طرف بطور مشورہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔‘‘

گارڈ نے کہا۔ ’’جو اچھا ہو۔‘‘

سیکرٹری صاحب نے اسٹیشن ماسٹر عالم نگر سے کہا۔ ’’مگر ذرا جلدی کیجئے۔‘‘

اسٹیشن ماسٹر نے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ ’’ابھی لیجئے مہاراج‘ میں ابھی بستی میں ڈگی پٹوائے دیتا ہوں کہ اتفاق سے کان پور جانے والی گاڑی آ گئی ہے اگر کوئی جانا چاہے تو فوراً اسٹیشن پر پہنچے۔‘‘

یہ کہہ کر وہ تو ڈگی پٹوانے چلے گئے اور ہم نے اپنے شریک سفر کے شانہ پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’آیئے تو پھر تاش ہی کھیلیں۔‘‘

شریک سفر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ’’میری رائے میں اس وقت اگر ہم لوگوں کو کہیں سے افیون مل جائے تو یہ شغل نہایت مناسب ہو گا ورنہ اس سفر کی یہ صعوبتیں زندہ نہ چھوڑیں گی۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’بہر حال کان پور پہنچنے سے تو صبر ہی کر لیجئے۔ اب سوال یہ ہے کہ لکھنؤ پیدل چلئے گا یا یکہ وغیرہ کیا جائے یا اسی

ٹرین پر تشریف لے چلئے گا۔“

شریک سفر نے کہا۔”جو جی چاہے کیجئے‘ میرا دماغ اس وقت بالکل بے کار ہو رہا ہے۔“

ہم نے کہا۔”اس سفر کو ایک حادثہ سمجھ کر‘ یہ سمجھئے کہ مشیت کانگریس میں کیا چارہ ہے اور صبر کی کوشش کیجئے۔“

شریک سفر نے کہا۔”آپ کو دل لگی سوجھ رہی ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ دم نکلا جا رہا ہے اس خیال سے کہ اگر میں آج نہ پہنچ سکا کانپور‘ تو کیا حشر ہو گا۔“

ہم نے کہا۔”میں بھی بالکل یہی سوچ رہا تھا مگر اس ترمیم کے ساتھ کہ کانپور پہنچتے پہنچتے کیا حشر ہو گا۔“

شریک سفر نے کہا۔”ارے صاح جب تک چل کر ان عقل کے بیل ڈرائیور صاحب سے یہ کہنا چاہئے کہ اپنا انجن ادھر سے ہٹا کر اب لکھنو کی طرف ٹرین میں لگا دیں تا کہ جب مسافر آ جائیں تو یہ مرحلہ باقی نہ رہے۔ بس گاڑی فوراً ہی چھوڑ دی جائے۔“

ہم نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ٹہلتے ہوئے انجن کے قریب پہنچ گئے‘ مگر وہاں ڈرائیور صاحب کا پتہ بھی نہ تھا‘ کلوفائر مین بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان سے کہا تو انہوں نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا کہ”جلدی ہی کیا ہے یہ تو دو منٹ کا کام ہے مگر سواریاں ملنا آسان کام نہیں ہے کون ایسا ملے گا جو حکم کا منتظر تیار بیٹھا ہو اور ڈگی کی آواز سنتے ہی چلا آئے۔“

ہم نے کہا۔”پھر کیا ہو گا۔“

کلوفائر مین نے کہا۔”ہو گا کیا‘ تھوڑی دیر جھک مارا جائے گا۔“

شریک سفر نے کہا۔”پھر اب کیا کریں۔“

کلوفائر مین نے برجستہ کہا۔”آیئے حقہ پیجئے۔“

ہمارے شریک سفر صاح کی طبیعت تو خوش ہو گئی ہو گی اس جواب پر‘ مگر بظاہر تو یہ معلوم ہوا کہ حقہ کے بجائے آپ جل کر رہ گئے اور کلوفائر مین کی طرف بطور اظہار ناراضگی اپنا رخ بدل کر ہم سے بولے کہ۔

”آیئے صاحب جب تک چل کر غسل خانہ ہی ہو آئیں۔“

ہم نے لفظ غسل خانہ پر شک کرتے ہوئے کہا۔”غسل خانہ سے غالباً آپ کا مقصد کچھ اور ہے۔“

شریک سفر نے مسکرا کر کہا۔”جی ہاں بات یہ ہے کہ مجھ کو بیت الخلاء وغیرہ سے زیادہ یہ لفظ پسند ہے۔“

ہم نے کہا۔”اچھا تو چلئے‘ مگر ریلوے کا یہ خاص حکم ہے کہ جب تک ٹرین اسٹیشن پر کھڑی رہے کموڈ کوئی صاحب استعمال نہ کرے۔“

شریک سفر نے کہا۔”تو کیا یہ حکم ایسی ٹرین کے لیے بھی ہے جس کے چلنے کے متعلق روایات میں شدید اختلاف ہو۔ بہر حال میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ٹرین چلنے کا انتظار کر لوں۔ اس لیے کہ یہ ضرورت فوری اور اشد ضروری نہیں ہے۔“

شریک سفر کے اس ارادہ کو ملتوی کرانے کے بعد‘ ہم دونوں نے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کر دیا گویا اپنا مفلوج ٹرین کو شنٹنگ کا درس دینے لگے‘ دیر تک ٹہلتے رہے پھر ایک جگہ بیٹھ کر دونوں نے اونگھنا شروع کیا۔ پھر اس شغل سے بھی دل بھر گیا اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر گنگنانے لگے۔ مختصر یہ کہ اسی طرح تقریباً دو گھنٹہ کا وقت صرف کیا اور خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب عالم نگر پیروں میں کھڑاؤں کی بجائے چپل اور ننگے جسم پر کھدر کا کرتا پہنے ہوئے منہ میں دتون کے بجائے بیڑی دبائے تشریف لے آئے اور آپ کو دیکھتے ہی تمام مسافروں نے جو ادھر ادھر منتشر تھے آپ کو گھیر لیا‘ تا کہ آپ سب کی تقدیر کا فیصلہ سنا دیں۔ مگر آپ نے سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مہاراج اب تو کوئی امید مسافروں کی ہے نہیں۔ دو مرتبہ ڈگی پٹ چکی ہے مگر اب تک کوئی مسافر نہیں آیا پھر اب کیا کرنا چاہئے۔“

مسافروں نے یہ سن کر غل مچانا شروع کیا کہ۔”ہم کو لکھنو واپس پہنچا دیا جائے‘ ہم کان پور جانے سے باز آئے اور کان پکڑے ہمیشہ کے لیے اس ریل کے سفر سے۔“

سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے ہاتھ جوڑ کر مجمع کو مخاطب کیا۔

”بھائیو! اگر تم نے اس پہلے ہی امتحان میں ہمت ہار دی اور خود اپنے راج اور اپنے انتظام کی اس طرح شکایت کی‘ تو یہ سوراج کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک بہت چھوٹی سی بات ہے اور ذرا سی غلطی ہو گئی ہے‘ ابھی تو آپ کو اپنے دیش کا انتظام سنبھالنے کے لیے بہت بڑی بڑی غلطیوں اور سخت دشواریوں کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اس وقت ٹرین کے چھوڑنے کی طرف سے مایوس کر رہا ہوں بلکہ میں تو آپ کو ایک بات بتا رہا ہوں۔ گاڑی تو خیر ابھی چھوڑی جاتی ہے مگر آپ یہ باتیں گرہ میں باندھ لیں جو میں نے کہی ہیں اور خوب سمجھ لیں کہ ایک ملک کا انتظام کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

یہ پند آمیز تقریر کرنے کے بعد آپ نے گارڈ سے کہا کہ گاڑی چھوڑ دیجئے‘ چنانچہ تمام مسافر اپنی اپنی جگہ پر پہنچ گئے اور ڈرائیور نے انجن میں بیٹھ کر اس کو سنسنانا شروع کیا تا کہ انجن کو ٹرین سے علیحدہ کر کے لکھنو کی طرف لا کر لگا دیا جائے۔ مگر خدا جانے کیوں

اس نے انجن جو چھوڑا تو پوری ٹرین اس کے ساتھ چلی اور ہم کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں اب پھر غلطی سے ٹرین بجائے لکھنو کے ہردوئی وغیرہ تو نہیں بھیجی جارہی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ عین اسی وقت گارڈ صاحب نے غل مچانا شروع کر دیا کہ ”ارے انجن کھولا نہیں گیا ہے۔ روکو گاڑی روکو۔“

ڈرائیور نے فوراً ٹرین روک کر انجن کو ٹرین سے علیحدہ کر لیا مگر اب ایک اور گتھی یہ پڑ گئی تھی کہ گارڈ کا ڈبہ ہونا چاہئے سب سے پیچھے۔ جیسا کہ اب تک تھا مگر اب جدید انتظام کے ماتحت وہ انجن کے بعد سب سے آگے ہوا جا رہا تھا‘ یہ ممکن تھا کہ انجن کو لیجا کر گارڈ کا ڈبہ ادھر لایا جاتا اور پھر انجن ادھر لگایا جاتا۔ مگر اس طول عمل کے لیے کوئلہ کافی نہ تھا اور اندیشہ تھا کہ ٹرین لکھنو تک نہ پہنچ سکے گی۔ لہٰذا اس اہم سوال کو سلجھانے کے لیے ڈرائیور اور گارڈ دونوں سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کے پاس پہنچے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا گیا‘ انہوں نے پہلے تو سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا اس کے بعد کہا۔

”میرے خیال میں تو مسافر اس پر برا نہ مانیں گے کہ گارڈ کا ڈبہ مجبوری کی وجہ سے آگے رہے۔ یہ بے ادبی ضرور ہے مگر کیا کیا جائے‘ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ آپ گارڈ کے ڈبہ کو آگے ہی رہنے دیجئے۔“

ڈرائیور نے یہ فیصلہ سننے کے بعد انجن کو چھوڑ دیا اور آدھ گھنٹہ کی مسلسل کوشش کے بعد انجن کو لکھنو کی جانب ٹرین میں لگا دیا گیا اور گارڈ نے جھنڈی دکھا کر سیٹی بجادی اور ٹرین خراماں خراماں روانہ ہوئی۔ ادھر ٹرین روانہ ہوئی اور ادھر ہمارے شریک سفر نے بقول اپنے ”غسل خانہ“ کا رخ کیا۔

ٹرین کی رفتار میں اب بھی وہی نذاکت‘ وہی الھڑ پن اور وہی لوچ تھا۔ کبھی تو اونٹ کی چال چلتی تھی‘ کبھی گھوڑے کی دلکی کا نمونہ پیش کیا جاتا تھا۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ چیونٹی رینگ رہی ہے مگر ان حالتوں میں رفتار اوسطاً دو گھنٹہ فی میل سے زیادہ نہ تھی‘ بلکہ کبھی کبھی تو جب خط شکست میں چلنا شروع کر دیتی تھی تو اس سے بھی کم رفتار کا اوسط رہ جاتا تھا۔ ہم اس رفتار پر دل ہی دل میں ہزار جان سے قربان ہو رہے تھے اور اونٹ گاڑی کو از سر نو رواج دینے کی اسکیم پر غور کر رہے تھے کہ غسل خانہ کا دروازہ اندر ہی سے ہمارے شریک سفر نے پیٹنا شروع کر دیا۔ لہٰذا ہم فوراً اس کے پاس پہنچے اور سمجھے کہ شاید ان حضرت سے دروازہ کھل نہیں رہا ہے مگر ہمارے پہنچتے ہی انہوں نے دروازہ کھول کر لوٹا باہر نکال دیا اور اندر ہی سے کہا۔ ”اس میں پانی کا انتظام کرو ورنہ بڑی مصیبت ہوگی۔“

ہم نے کہا۔ ”کیا آپ خالی لوٹا لے کر تشریف لے گئے تھے۔“

انہوں نے اندر ہی سے کہا۔ ”ہاں بھائی سوچا تھا کہ اس کے نل سے پانی لے لیں گے۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر کیوں نہیں لیا۔“

شریک سفر نے کہا۔ ”پانی ہے ہی نہیں صرف نل لگا ہوا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”مگر ٹرین تو چل رہی ہے۔“

شریک سفر نے کہا۔ ”ارے صاحب کون سی تیز چل رہی ہے‘ کہیں پانی نظر پڑے اتر کر لے لیجے۔“

ہم نے لوٹا ہاتھ میں لے لیا اور کھڑکی سے جھانک کر پانی ڈھونڈنے لگے۔ اتفاق سے ریل کی پٹری کے قریب ہی ایک کنوئیں پر کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ لہٰذا ہم نے فوراً اس رینگتی ہوئی ٹرین سے اتر کو کنوئیں کی طرف ایک جست کی‘ اور دوڑ کر ان عورتوں کے پاس پہنچے ان سے لوٹے میں پانی لیا اور اب جو گھوم کر دیکھتے ہیں تو ٹرین کوئی نصف فرلانگ آگے نکل چکی تھی۔ لہٰذا ہم دوڑے اس طرف اور نہایت آسانی کے ساتھ ٹرین کو پکڑ لیا اور اپنے ڈبہ میں پہنچ کر اپنے شریک سفر کو لوٹا دے دیا‘ جنہوں نے نہایت سچے دل سے ہمارا شکریہ کموڈ پر بیٹھے ہی بیٹھے ادا کیا۔ ہمارے شریک سفر کے نکلنے کے بعد ہی ٹرین لکھنو اسٹیشن کے احاطہ میں پہنچ گئی اور چند منٹ میں ہم دنیا کے گول ہونے کا ثبوت لے کر اسی جگہ آ گئے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔

چند گھنٹہ ہم اسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ٹرین کے چلنے کی دعائیں مانگ رہے تھے چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہماری دعائیں کیسی قبول ہوئیں کہ ٹرین بھی چلی‘ ہم نے بھی سفر کیا اور پھر

”بسلامت روی باز آئی“

کے دعائیہ مصرعہ کی تفسیر بنے ہوئے ہم پھر جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں یعنی باوجود تمام خوش انتظامیوں کے اپنا سلسلہ جاری رکھیں یا ”خیر سے بدھو گھر آئے“ کی پھبتی کے مخاطب صحیح بنے ہوئے گھر چلے جائیں۔ ہم نے اس سوال پر بار بار غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ ہم کو گھر چلنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ کان پور میں کام بے حد ضروری تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ مجبوریوں پر عبور کرنے سے ہم قاصر تھے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی مجبوری تھی کہ فرض کر لیجئے کہ ہم مر جاتے تو کیا کرتے۔ بالکل اسی طرح ناگہانی طور پر سوراج کے مل جانے سے سفر دشوار ہو گیا تھا اور یہ ہمارے لیے قطعاً ناممکن تھا کہ ہم وقت مقررہ پر کان پور پہنچ جاتے۔ لہٰذا ہم نے اپنا سامان اتارا اور تمام سامان ایک ہی مرتبہ میں مارے جوش کے‘ اپنے اوپر لاد کر باہر جانے کے لیے دروازے پر پہنچے تو یہاں ایک تماشہ تھا کہ کسی کو باہر جانے کی اجازت نہ تھی‘ خواہ وہ ٹکٹ دکھائے یا یوں ہی جانا چاہے۔ دو تین کانگریسی والنٹیر راستہ روکے کھڑے تھے اور مسافروں کا ایک مجمع تھا‘ جو باہر جانے کی پیہم کوششیں کر رہا تھا اور وہ رضا

کار برابر روک رہے تھے۔ آخر ہم نے آگے بڑھ کر ان سے پوچھا۔

”کیوں بھئی بات کیا ہے؟ آخر کیوں روکتے ہو؟“

ایک رضا کار نے کہا۔ ”آپ کے پاس ٹکٹ ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہاں یہ کان پور کا ٹکٹ ہے؟“

رضا کار نے کہا۔ ”بس تو اس سے آپ کان پور ہی کے اسٹیشن پر اتر سکتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ کیوں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ یہ کان پور کا ہے لکھنو کا نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”مگر ہم نے یہ ٹکٹ یہیں سے تو خریدا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ہاں بابو جی خریدا تو ہے مگر جانے کے لیے آنے کے لیے نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”بھائی ابھی نہ تو ہم کہیں گئے ہیں نہ کہیں سے آئے بلکہ اپنا سفر ملتوی کر رہے ہیں۔“

والنٹیر نے کہا۔ ”اسی لیے تو ہم آپ کو روک رہے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ کیا بات؟“

رضا کار نے کہا۔ ”صاحب بات یہ ہے کہ آپ کو کچھ تکلیف پہنچی ہے اسی لیے آپ سفر ملتوی کر رہے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ باہر چلے گئے تو سب سے شکایت کریں گے اور اس شکایت کا اثر پبلک پر برا پڑے گا۔ لہٰذا آپ نے جہاں اتنی مصیبت اٹھائی ہے وہاں یہ کرپا اور کیجئے کہ اب جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیے۔ وہ بس اب سیدھی کانپور جائے گی اب ذرا بھی دیر نہ ہوگی۔“

ہم نے کہا۔ ”خیر اب ہمارا جانا تو ناممکن ہے البتہ اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہم کو چھوڑ دو تو ہم کسی سے اس بد انتظامی اور ”سودیشی گھس گھس“ کی شکایت نہ کریں گے۔“

والنٹیر نے ہاتھ جوڑ کر کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”بابو جی ہم مجبور ہیں آپ اسٹیشن ماسٹر سے کہئے یا سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی سے کہئے وہ آپ کو اجازت دے سکتے ہیں۔“

ہم لاحول پڑھتے ہوئے ان بدتمیزوں کے پاس سے چلے آئے اور سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گئے جو اتفاق سے سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی سے بیٹھے ہوئے اس ٹرین کے متعلق کوئی اہم مشورہ کر رہے تھے ہم کو دیکھتے ہی دونوں صاحبان

خاموش ہو گئے اور اسٹیشن ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ ”کہئے صاحب کیا حکم ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”صاحب آپ کا والنٹیر ہم کو باہر نکلنے سے روکتے ہیں اور ہم کو چونکہ اب کانپور جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے لہٰذا ہم گھر واپس جانا چاہتے ہیں۔“

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مسکرا کر ایک ادائے دلبری کے ساتھ فرمایا۔ ”بات یہ ہے کہ مسٹر کہ والنٹیر وں کو یہی حکم دیا گیا ہے اور ہم آپ سے بھی یہی کہیں گے کہ آپ کرپا کر کے باہر نہ جائیے بلکہ ٹرین میں بیٹھئے یہ آپ کا قومی کام ہے قوم کے لیے آپ نے جیلوں میں برسوں اور مہینوں قیدی کی زندگی بسر کی ہے۔ آج اپنی قوم کے قیدی بن جائیے مگر باہر جانے کا ارادہ ہی دل میں نہ لائیے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے اگر آپ ہم کو باہر جانے کی اجازت دے دیں۔“

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”ہم آپ سے بنتی کرتے ہیں کہ اس وقت آپ باہر نہ جائیں بلکہ اگر کوئی کام نہ بھی ہو تو سو کاموں کا ہرج کر کے کان پور چلے جائیں آپ کے باہر نکلنے سے ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ کسی ایک آدمی کو بھی باہر نہ نکلنے دیں گے نہیں تو آج نئے انتظام کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں وہ سب مشہور ہو جائیں گی اور اس سے ہم کو سخت نقصان پہنچے گا آپ کو کرپا کر کے خود بھی بیٹھئے ٹرین میں اور دوسروں کو بھی سمجھائیے۔“

یہ کہہ کر اسٹیشن ماسٹر نے کچھ اس التجا بھری نظر سے ہم کو دیکھا کہ ہم مجبور ہو گئے اور یہ طے کر کے ان کے پاس سے واپس چلے آئے کہ جو کچھ بھی ہو اب تو جانا ہی پڑے گا کان پور مگر اسٹیشن ماسٹر صاحب کے کمرہ سے جو باہر نکلے تو باہر کے دروازہ پر ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ باہر نکلنے کی کوشش کرنے والے مسافر ایک طرف صف آرا تھے اور اسٹیشن کا عملہ یعنی کانگریسی رضا کار دوسری طرف پھاٹک کو روکے ہوئے اس انداز سے کھڑے تھے کہ گویا پکٹنگ کر رہے ہیں۔ اس طرف سے اس بات پر زور دیا جا رہا تھا کہ پھاٹک کھل جائے اور رضا کاروں کی طرف سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر خوشامدیں ہو رہی تھیں کہ آپ لوگ ٹرین میں بیٹھئے یہاں تک کہ وہ لوگ بھی باہر نکلنے نہ پاتے تھے جو اس ٹرین پر سوار نہ تھے۔ بلکہ یونہی تفریحاً اسٹیشن گھومنے آئے تھے۔ یا وہ لوگ جو عالم نگر کے اسٹیشن سے محض اس لیے سوار ہو گئے تھے کہ لکھنو تک چلے جائیں گے۔ ایک عجیب کشمکش کا سلسلہ جاری تھا۔ مسافر اس ٹرین کے سفر کی صعوبتوں سے تنگ آ کر جان پر کھیلے ہوئے تھے کہ ضرور باہر نکل جائیں گے اور والنٹیر اپنے افسران بالا کے حکم سے مجبور تھے کہ کسی ایک کو بھی باہر نہ نکلنے دیں نتیجہ اس کشمکش کا یہ تھا کہ رضا کاروں نے واقعی پکٹنگ شروع کر دی تھی اور مسافروں کی طرف سے

ضد میں تشدد پیدا ہو چلا تھا۔ یعنی ایک آدھ بگڑے دل مسافر نے ایک آدھ رضا کار کو ڈھکیل کر باہر نکل جانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی اور باقی رضا کار بھی اسی خطرہ میں مبتلا کھڑے تھے اور ایک ایک کے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ ادھر مسافروں کا مجمع اس کا منتظر کھڑا تھا کہ ایک مسافر بھی باہر نکلے تو وہ متحدہ یورش کر کے باہر نکل جائیں۔ آخرکار جب بیچارے رضا کاروں پر مسافروں کی طرف سے تشدد شروع ہو گیا تو وہ فوراً یکے بعد دیگرے لیٹ گئے اور مسافروں سے کہہ دیا کہ ہم کو روند کر‘ کچل کر‘ پامال کر کے اگر باہر نکلنا چاہو تو نکل جاؤ۔ جب قصہ نے یہاں تک طول کھینچا تو اسٹیشن ماسٹر صاحب اور سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کو بھی موقع پر آنا پڑا اور ان کے ساتھ اسٹیشن کے دیگر افسران بھی آموجود ہوئے یعنی گارڈ صاحب‘ ڈرائیور صاحب‘ کلو فائرمین وغیرہ۔ ان لوگوں نے آتے ہی اپنی اپنی زبان میں مسافروں کو سمجھانا شروع کر دیا اور مسافران سے بھی لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آخر سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے انکوائری آفس کی کھڑکی پر کھڑے ہو کر مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔“

”متروا ور سجنو! آپ سے میں اس وقت صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ نے جہاں اتنی تکلیف اٹھائی ہے تھوڑی سی تکلیف اور اٹھا کر جو کچھ میں کہوں وہ سن لیجئے اس کے بعد آپ کا جو دل چاہے کیجئے گا۔ میں آپ سے صرف یہ کہتا ہوں کہ اس وقت آپ کا اس سفر کو ملتوی کرنا ہماری بڑی بدنامی ہے۔ ہماری بدنامی آپ کی بدنامی اور دیش کی بدنامی ہے۔ دنیا اس پر ہنسے گی کہ سوراج لینے کو تو لے لیا مگر اب سنبھالے نہیں سنبھلتا‘ آپ اس بدنامی سے اپنے کو ہم کو اور اپنے دیش کو بچایئے‘ غیروں کو ہنسنے کا موقع نہ دیجئے‘ ہم نے اس کا انتظام کر دیا ہے کہ اب آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی‘ بلکہ یہ ٹرین اب سیدھی کان پور جائے گی اور جو غلطیاں اب تک ہو چکی ہیں۔ وہ اب نہ ہوں گی صرف اتنا انتظار اور کر لیجئے کہ ذرا کوئلہ آ جائے اور اس لیے کہ کوئلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کو نہایت آسانی کے ساتھ کانپور پہنچا دیا جائے گا‘ چاہے وہاں سے پھر آپ اسی ٹرین پر واپس آ جائیں‘ آپ سے واپسی کا کرایہ بھی نہ لیا جائے گا۔“

مجمع میں ایک شخص نے کہا۔ ”مگر صاحب ہم کو اب جانے کی ضرورت نہیں“ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے نہایت خوشامد سے کہا۔ ”شریمان میں بھی تو کہہ رہا ہوں کہ آپ اس وقت بغیر ضرورت کے بھی اس سفر پر جائیں اور سو کاموں کا ہرج کر کے جائیں۔“

ایک اور آواز ”اور اگر ہم اسے باوجود نہ جانا چاہیں تو۔“

سیکرٹری صاحب ٹاؤن کمیٹی نے کہا۔ ”تو ہم آپ کے ہاتھ جوڑیں گے‘ گوڑ چھوئیں گے منت کریں گے‘ آپ سے کوئی زور تو کر سکتے نہیں اس لیے کہ سوراج ضرور ہم کو ملا ہے مگر جس طرح ہم کو ملا ہے اسی طرح آپ کو بھی ملا ہے‘ ہم کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہم

آپ پر کوئی زیادتی کریں آپ دیکھ لیجئے کہ ہماری حکومت میں کہیں پولیس کا نام بھی نہیں ہے۔ پہلے اگر آپ اس قدر ضد کرتے‘ تو پولیس سے آپ کو دھمکایا جاتا۔ مگر اب تو یہ کانگریس کے والنٹیر ہیں‘ پہلے پولیس کے ڈنڈے تھے اب ان کے خوشامد سے‘ جڑے ہوئے ہاتھ ہیں۔ پہلے سینہ تان کر آپ کو پیچھے ڈھکیلا جاتا تھا‘ اب یہ والنٹیر زمین پر لیٹے ہوئے ہیں کہ اگر جاتے ہو تو ہم کو کچل کر جاؤ۔ کیا اس کے باوجود آپ کی ضد بدستور قائم رہے گی حالانکہ آپ کی یہ ضد سوائے اس کے کہ اپنے ساتھ ہو اور کسی کے ساتھ نہیں ہے۔“ مجمع میں اس ایک شخص نے کہا” اچھا صاحب تو کوئلہ منگوانے میں اب کیا دیر ہے۔“

سیکرٹری صاحب نے کہا۔ ”کوئلہ آتا ہی ہے بس آپ چل کر بیٹھئے پھاٹک چھوڑ دیئے والنٹیروں کو پکٹینگ اٹھانے دیجئے‘ تو کلوفائرمین دوڑ کر کوئلہ لے آئے۔“

اب لوگوں نے وہاں سے منتشر ہونا شروع کر دیا اس لیے کہ بہت سے لوگ سیکرٹری صاحب کی تقریر سے متاثر ہوئے تھے بہت سے باہر نکلنے کی کوشش سے مایوس ہو چکے تھے۔ اور بہت سے اس خیال سے ہٹ گئے تھے کہ پکٹینگ اٹھتے ہی موقع دیکھ کر باہر نکل جائیں گے۔ بہر حال مجمع کے منتشر ہونے کے بعد کلوفائرمین کو فوراً واپس آنے کی ہدایت کر کے کوئلہ لینے کے لیے باہر بھیج دیا گیا اور ادھر یہ کوشش شروع ہو گئی کہ مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا ایک مسافر کو بمشکل تمام بٹھایا جاتا تھا تو چار باہر آ جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ جب گارڈ صاحب اور اسٹیشن ماسٹر صاحب اس کوشش میں پریشان ہو گئے تو سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی جو اس وقت علق کل بنے ہوئے تھے۔ طلب کیے گئے اور آپ نے یہ مشورہ دیا کہ ٹرین کے ہر ڈبہ میں سے ایک ایک مسافر کو منتخب کر کے اس ڈبہ کا انچارج بنا دیا جائے جو اپنے ڈبہ کے باہر نکلے ہوئے مسافروں کو بٹھائے اور بیٹھے ہوئے مسافروں کو باہر نہ نکلنے دیں۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل شروع کیا گیا اور نسبتاً بہت زیادہ کامیابی ہوئی لیکن اب بھی پلیٹ فارم پر مسافروں کی کمی نہ تھی‘ جن کو بٹھانے کی ہر ممکن کوشش ہو رہی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر مسافر بیٹھتے جاتے ہیں تو یہ ٹہلنے والے مسافر کہاں سے آ جاتے ہیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم سے مسافر ابل رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسی کوشش میں اتنی دیر لگی کہ کلوفائرمین کوئلہ لے کر واپس آ گیا اور اس نے انجن میں کوئلہ ڈال کر انجن کو کلکتہ کی سمت سے ہٹا کر کان پور کی طرف لا کر لگا دیا۔ اب صرف اس بات کی دیر تھی کہ مسافر بیٹھ جائیں تو ٹرین چھوڑ دی جائے آخرکار بمشکل تمام اس کوشش میں کامیابی حاصل کی گئی اور اسٹیشن ماسٹر صاح نے خود اپنے اہتھ سے گھنٹہ بجا کر گویا ٹرین کو جانے کی اجازت دے دی۔ گارڈ صاحب نے بھی اس خیال سے کہ شائد ڈرائیور اس شور و غل میں سیٹی کی آواز نہ سنے اور گھبراہٹ میں جھنڈی کے سبز رنگ کو سرخ نہ سمجھ لے دوڑ کر انجن کے پاس جا کر سیٹی بجا دی اور فوراً سبز

جھنڈی دکھا کر ڈرائیور سے کہا۔ ”چلو جلدی بس اب۔“

ڈرائیور نے کہا ”چلتا ہوں مگر آپ تو جا کر اپنے ڈبے میں بیٹھیے۔“

گارڈ نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ”تم بالکل بے وقوف ہو۔ تم کو نہیں معلوم کہ گارڈ ہمیشہ چلتی ہوئی گاڑی پر سوار ہوتا ہے۔ میں گارڈ ہوں‘ چلتی ہوئی گاڑی پر سوار ہوں گا۔ تم چھوڑو ٹرین‘ کیا پھر سیٹی بجاؤں؟“

ڈرائیور نے کہا۔ کیا کیجیے گا اب۔ بجا کر اچھا خیر احتیاطاً بجا دیجیے۔“

یہ سن کر گارڈ صاحب نے پھر سیٹی بجائی‘ جس کا جواب ڈرائیور نے انجن کی سیٹی سے دیا اور ٹرین چھوڑ دی۔ گارڈ صاح نے اپنے ڈبے سے دور بالکل انجن کے پاس کھڑے ہوئے اس کے منتظر تھے کہ جب ان کا ڈبہ قریب پہنچے گا تو وہ اپنی مخصوص ”گارڈیانہ“ شان کے ساتھ اس کا ڈنڈا پکڑ کر سوار ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب آپ کا ڈبہ قریب آیا تو آپ نے لپک کر اس کا ڈنڈا پکڑنا چاہا اور اسی کے ساتھ پیر بھی اٹھ گئے جن کو ٹرین کے فٹ بورڈ پر ہونا چاہیے تھا مگر خدا جانے نشانہ کیونکر غلط ہو گیا کہ آپ کا ڈبہ تو صاف نکل گیا اور آپ ہاتھ پھیلائے ہوئے اوندھے منہ کچھ اس طرح پلیٹ فارم کے نیچے لائن پر گرے کہ سر الگ مرمت طلب ہو گیا اور منہ سے الگ خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ آپ کے گرتے ہی اسٹیشن سے وہ حشر خیز شور برپا ہوا کہ ڈرائیور نے فوراً ٹرین روک لی اور سب نے مل کر گارڈ صاحب کو جو خون میں نہائے ہوئے تھے‘ لائن پر سے اٹھایا اور مرہم پٹی شروع کر دی کسی نے اپنا ریشمی کمر بند‘ دیا سلائی سے جلا کر زخموں میں بھرا تو کسی نے اپنی دھوتی کا ایک حصہ پھاڑ کر بینڈج کے لیے دیا مختصر یہ تھوڑی ہی دیر میں آپ مرہم پٹی کے بعد جنگ عظیم کے زخمی سپاہی کی حیثیت سے ٹرین کے ایک ڈبہ میں لٹا دیئے گئے اور آپ کی جھنڈیاں اور سیٹی وغیرہ خود سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے لے کر ایک دوسرے کھدر پوش کو دے دی کہ فی الحال تم ہی گارڈ بنو۔ مگر اسی کے ساتھ ہدایت کر دی کہ جب تک ٹرین حرکت میں ہو اس سے اترنے کی کوشش نہ کرنا اور جب تک تم بیٹھ نہ جانا سبز جھنڈی نہ دکھانا‘ تا کہ اس طرح گرنے کا کوئی امکان نہ باقی رہے۔ ان تمام ہدایات کے بعد ایک مرتبہ پھر مسافروں کو بٹھایا گیا اور ان نئے گارڈ صاحب نے اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر اور ہر طرح اس بات کا اطمینان کرنے کے بعد وہ واقعی بیٹھ گئے ہیں کھڑکی میں سے نہایت احتیاط کے ساتھ منہ نکال کر پہلے تو سیٹی بجائی‘ پھر جھنڈی دکھا کر ٹرین چھوڑ دی۔

اب ٹرین نے پھر اپنے اسی خراماں خراماں والے انداز رفتار سے اس طرح چلنا شروع کیا گویا کوئی نئی دلہن اپنی سسرال میں چھمک چھمک چل رہی ہے اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اس لیے رکھ رہی ہے کہ ساس یا نندیں اعتراض نہ شروع کر دیں کہ دو

دن کی دلہن اور چال ہے کہ جیسے چلاوہ۔ دلہن کیا ہے‘ اچھی خاصی گھوڑی ہے۔ ٹرین کی اس رفتار میں وہ قیامت کی پامالی تھی کہ مسافروں کے دل پسے جاتے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کافی سبک رفتار ٹرین کی لائن پر اگر بتاشہ بھی رکھ دیا جائے تو وہ بھی نہ ٹوٹے گا حالانکہ صرف سبک خرامی ہی نہ تھی بلکہ کبھی آہستہ خرام تھی تو کبھی مخرام بن جاتی تھی اور کبھی ایک جھٹکے کے ساتھ ایسی آمد کی آتی تھی کہ گویا اب جو چلے گی۔ تو ہوا ہو جائے گی مگر پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس طرح رک جاتی تھی گویا کوئی شوخ حسینہ یکا یک کسی غیر مرد کو دیکھ کر ٹھٹک جائے کبھی دلکی چلنے لگتی تھی تو کبھی یہ معلوم ہوتا کہ کنگارو چل رہا ہے‘ کبھی معلوم یہ ہوتا کہ ہم ہاتھی پر بیٹھے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور کبھی اتنے جھٹکے پہنچتے تھے کہ اپنے اوپر شتر سوار ہونے کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ مختصر یہ کہ اسی رفتار سے چل کر خدا خدا کر کے یہ ٹرین کان پور کے راستہ کی پہلی منزل یعنی اموسی کے اسٹیشن پر پہنچی۔

اموسی اسٹیشن پر ایک نیا قصہ یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ وہ بغیر سگنل کے گرے ہوئے ٹرین کو اسٹیشن پر کیوں لایا۔ ڈرائیور نے پہلے تو اس اعتراض کو ہنس کر ٹال دینا چاہا مگر جب اسٹیشن ماسٹر نے ترش روئی کے ساتھ کہا کہ ”جب تک میں نے سگنل نہیں دکھایا آخر تم کو حق کیا تھا کہ تم ٹرین کو اسٹیشن کے اندر لاؤ۔“

اب تو ڈرائیور سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بھی ایک قانونی نکتہ نکالا کہ ”لیکن جب تم نے ٹرین کو آتا ہوا دیکھ لیا تھا تو سگنل کیوں نہیں دکھایا۔“

اسٹیشن ماسٹر نے لاجواب ہو کر کہا ”نہیں دکھایا ہم نے سگنل‘ اس پر اعتراض کرنے والے آپ کون؟“

ڈرائیور نے برجستہ کہا ”تو لے آئے ہم بھی گاڑی‘ اس پر اعتراض کرنے والے آپ کون؟“

اسٹیشن ماسٹر نے کہا ”ٹرین لانے پر میں اعتراض کر سکتا ہوں۔ مجھ کو حق حاصل ہے اور بغیر میری اجازت کے تم ہرگز ٹرین اسٹیشن پر نہیں لا سکتے۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”جی ہاں چاہے آپ گھر پر پڑے ہوئے سوتے رہیں اور میں آپ کے حکم کے انتظار میں سگنل پر ٹرین لیے کھڑا رہوں‘ آپ کا فرض تھا کہ ٹرین کو دیکھتے ہی سگنل دکھاتے‘ اب سگنل نہیں دکھایا ہے تو آئے وہاں سے مجھ پر آنکھیں نکالتے۔“

اموسی اسٹیشن کے ایک اور ملازم نے بیچ میں آ کر ڈرائیور سے کہا۔ ”بھیا سنو تو سہی‘ اس میں غصہ کی کوئی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ ریلوے کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر اسٹیشن ماسٹر سگنل نہ گرائے تو ٹرین آگے نہیں بڑھ سکتی خواہ جتنی دیر بھی لگے‘ اس لیے کہ بغیر اس کے سگنل دکھائے ہوئے اگر تم گاڑی کو اسٹیشن پر لے آؤ گے تو اس کے لڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ غلط پٹری کے لگے

ہونے کی وجہ سے ٹرین الٹ جائے یا خدا جانے کیا واقعہ پیش آئے۔ ان سب باتوں کی ذمہ داری اسٹیشن ماسٹر پر ہوتی ہے۔ وہی ذمہ دار ہوتا ہے اور اسی سے جواب طلب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آئندہ سے ایسا ہرگز نہ کرنا نہیں تو مصیبت ہی آ جائے گی۔“

ڈرائیور نے اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ بھی ان ہی کی سی باتیں کہنے لگے، ذرا خدا لگتی کہیے کہ آخر جب انہوں نے ٹرین کو آتا ہوا دیکھا تو سگنل کیوں نہیں دکھایا اس وقت پلیٹ فارم پر سوائے اس ٹرین کے اور کون سی ٹرین گاڑی کھڑی تھی یا اور کون سی رکاوٹ تھی کہ آپ نے سگنل نہیں دکھایا ایک تو یوں ہی گاڑی کو دیر ہو گئی ہے دوسرے آپ ہیں کہ الگ ہی سے دھونس جما رہے ہیں۔“

اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر گفتگو میں تلخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”تم دھونس کہتے ہو تو دھونس ہی سہی، تم کو دیر ہو گئی تھی تو ہماری بلا سے، مگر تم بغیر میری اجازت کے ایک قدم بھی پلیٹ فارم پر یا سگنل کے ادھر نہیں لا سکتے، تم ہو کس خیال میں۔“

ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو زخم خوردہ شیر کی طرح گھورتے ہوئے کہا۔ ”یا اللہ آپ تو گرم ہی ہوئے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ آپ نے آخر سگنل کیوں نہیں دکھایا۔“

اسٹیشن ماسٹر ”جی نہیں دکھایا ہم نے، پھر آپ کون؟“

ڈرائیور ”تو ہم بھی گاڑی لے آئے، پھر آپ کون؟“

اسٹیشن ماسٹر ”بتا دوں تم کو کہ میں کون ہوں؟“

ڈرائیور ”اجی جاؤ اپنا کام کرو، تم کیا بتاؤ گے ایسے ایسے بہت دیکھے ہیں۔“

اسٹیشن ماسٹر ”یہ بات ہے۔“

ڈرائیور ”ہاں ہاں یہی بات ہے، ہم ہزار بار گاڑی لائیں گے تم کو غرض ہو سگنل دکھاؤ، نہ غرض ہو نہ دکھاؤ، تم آخر اکڑتے کس بات پر ہو اگر تم اسٹیشن ماسٹر بنے پھرتے ہو تو میں تمہارا رائبل نہیں ہوں، میں بھی ڈرائیور ہوں ڈرائیور۔“

اسٹیشن ماسٹر نے کڑک کر کہا۔ ”ابے میں ابھی تیری ڈرائیوری نکالے دیتا ہوں۔“

اس وقت مسافروں کا مجمع ان دونوں، پالی کے مرغوں کو گھیرے ہوئے کھڑا تھا اور یہ گرم گفتگو سن کر گارڈ صاح اور سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی موقع پر آ موجود ہوئے تھے۔ لہٰذا ڈرائیور نے سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کی طرف متوجہ

ہوتے ہوئے کہا۔ ”ذرا دیکھ لیجیے صاحب ان کی باتیں، میں نے نوکری کی ہے، کوئی عزت نہیں بیچی ہے۔ یہ جب سے برابر اکڑ رہے ہیں اور آنکھیں دکھا رہے ہیں مجھ کو، میں ابھی تک چپ ہوں مگر اب میں بھی ان کا دماغ ٹھیک کئے دیتا ہوں، بڑے مرد کے بچے ہیں تو آ جائیں میدان میں یا یہی نہیں آج یا میں ہی نہیں۔“

یہ کہہ کر ڈرائیور نے اپنی دھوتی کس کر باندھی اور آستینیں چڑھا کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے آگے بڑھ کر کہا ”شانت رہو، آخر قصہ کیا ہے۔ ہم سے بتاؤ بات کیا ہے؟“

ادھر اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اپنی نہرو کیپ اتار کر اور کھدر کی بنڈی میز پر رکھ کر شیر کی طرح گرجتے اور گھوڑے کی طرح منہ سے پھین نکالتے ہوئے کہا ”آؤ ادھر آؤ۔ میں آج تم کو بیکنٹھ پہنچا دوں، بڑا آیا وہاں سے ڈرائیور کا بچہ بن کر، گدھے چراتے چراتے ٹرین چلانے لگا ہے۔ تو دماغ ہی خراب ہو گیا ابھی دماغ تیرا ٹھیک کئے دیتا ہوں تو ہے کس دھوکے میں۔“

اسٹیشن ماسٹر صاحب کو گارڈ صاحب نے لپک کر روکا، ادھر ڈرائیور کو سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی اس طرح پکڑے ہوئے تھے کہ وہ بار بار الف ہو رہا تھا، کلو فائر مین کا یہ حال تھا کہ کبھی تو اپنا مدریا حقہ لیے ہوئے ان کو سمجھانے کے لیے دوڑتے تھے، کبھی ان کو سمجھاتے تھے مگر بات کچھ ایسی بڑھ گئی تھی کہ یہ دونوں سوائے باہمی تو تکار کے اور کسی کی کچھ نہ سنتے تھے، آخر سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے اور بمشکل تمام دونوں کو چمکار کر چپ کیا پھر ڈرائیور سے پوچھا کہ

”آخر بات کیا ہے“ ڈرائیور نے غصہ میں ہانپتے ہوئے کہا۔

”صاحب بات کیا ہے، بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں نوکری کی ہس ہے عزت نہیں بیچی اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ عزت بیچی ہے تو ہم خود اس کی عزت اتارنے کو کافی ہیں۔“

اسٹیشن ماسٹر نے پھر رسیاں تڑا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑ دیجیے مجھ کو اس عزت دار کی عزت اسی وقت دیکھے لیتا ہوں۔“

سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریسی ممبر نے پھر بڑھ کر ان کی لگام لی اور ان سے پوچھا کہ ”آخر آپ ہی کچھ بتائیے کہ ہوا کیا۔“

اسٹیشن ماسٹر نے کہا ”صاحب ہوا یہ کان پور سے آ رہی ہے مال گاڑی، میں نے یہ سوچا کہ مال گاڑی کو یا تو کان پور کی طرف واپس کر دوں ورنہ جب وہ آ جائے تو اس کو دوسری لائن پر لگا کر اس ٹرین کو سگنل دوں گا تا کہ یہ لڑنے نہ پائے۔ مگر آپ کو دیکھئے کہ آپ نے نہ سگنل کا انتظار کیا نہ کچھ اور گاڑی لیے چلے آئے۔ اگر ٹرین لڑ جاتی تو گردن ہماری ماری جاتی اب جوان سے کہا تو لگے

اکڑنے‘ ایک تو غلطی کی ہے اس پر سے زبان لڑائی جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس کا بغیر سمجھے بوجھے ایسے نالائق بھر لیے گئے ہیں۔ یہ لوگ ہم سب کو بدنام کرنے والے‘ ہم کو نالائق کہلوانے والے اور سوراج کو بدنام کراکے‘ دنیا کو ہم پر ہنسوانے والے ہیں۔

ادھر ڈرائیور نے سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی سے کہا کہ ’’آپ کو معلوم ہے کہ کن وقتوں کے بعد ٹرین کو یہاں تک لا سکا ہوں اب بتائیے کہ خدا خدا کر کے جب ٹرین یہاں تک پہنچی تو آپ ہیں کہ سگنل نہیں دکھاتے حالانکہ گاڑی کو آتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور میں برابر سیٹی دے رہا ہوں کہ یہ سگنل گرائیں۔ مگر خدا جانے اس میں کون سی شان تھی کہ سگنل نہیں گرایا۔ آخر مجبور ہو کر میں ٹرین کو لیے ہوئے چلا آیا ہوں۔ تو اب آپ جامہ سے باہر ہوئے جاتے ہیں اور اپنے کو خدا جانے کیا سمجھ رکھا ہے کہ اکڑے ہی جاتے ہیں سیکڑوں باتیں مجھ کو سنا ڈالیں‘ مجھ کو اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ ان باتوں میں دیش کی اور سوراجیہ کی بدنامی ہے تو کب کا میں نے ان کی چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیا ہوتا۔‘‘

اسٹیشن ماسٹر نے یہ سنتے ہی گرج کر کہا ’’ابے تو کیا خون پیتا‘ تو نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہوتا تو آج ایک بزدل کی طرح دور نہ کھڑا ہوتا۔‘‘

ڈرائیور نے بھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کو ہاتھ مروڑ کر ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

’’اچھا اب تیری قضا نے تجھ کو گھیر لیا ہے اور زندگی بھاری ہو رہی ہے تو آ جا۔‘‘

ادھر اسٹیشن ماسٹر نے گارڈ صاحب کو ڈھکیل کر ایک جست کی اور ڈرائیور کے منہ پر وہ پٹاخہ چھوٹا ہے کہ مسافروں کے دام تو محض اس کی آواز سن کر وصول ہو گئے ہوں گے۔ مگر اس کے جواب میں ڈرائیور نے بھی سنبھل کر اور ذرا پینترا بدلتے ہوئے وہ سولہ نمبر کا کھلتا ہوا ہاتھ‘ اسٹیشن ماسٹر کے رخسار پر رسید کیا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنی نگاہوں کے سامنے کا اندھیرا دور ہونے کے بعد جھٹ کر ڈرائیور کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور ڈرائیور اس عرصہ میں علی الحساب اسٹیشن ماسٹر صاحب کے پھولے ہوئے گالوں پر دست درازی کر چکا تھا اور اب جبکہ اس کا گریبان اسٹیشن ماسٹر کی گرفت میں تھا اس نے بھی اسٹیشن ماسٹر صاحب کو اٹھا کر وہ گدا دیا کہ پلیٹ فارم پر زلزلہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بیچ بچاؤ کرنے والے اپنے کو بچا بچا کر ان دونوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر توبہ کیجیے اس جنگ میں ان کو اپنی مصالحانہ کوششوں میں موت کا خوفناک چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور واقعی کس کی شامت آئی تھی کہ وہ بیچ میں پڑ کر اپنی مرمت کرا دیتا اور دونوں کے تصادم میں خود اپنی جان دیتا۔ یہ دونوں باہم گتھم گتھا تھے کبھی اسٹیشن ماسٹر صاحب زور لگا کر اوپر آ جاتے تھے اور دو ایک ہاتھ رسید کر دیتے تھے۔ کبھی ڈرائیور ان کے سینہ پر سوار ہو کر

مارتے مارتے ان کا بھرتا نکال دیتا تھا‘ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی دور کھڑے ہوئے ’’شانتی شانتی‘‘ کے نعرے لگا رہے تھے‘ گارڈ صاحب الگ ایک ایک کے ہاتھ جوڑتے پھرتے تھے‘ مسافروں کا یہ حال تھا کہ کوئی صاح اس کشتی پر اپنے کسی دوست سے جوا کھیل رہے تھے کہ آ ؤ دونی دی گاڑی کا ڈرائیور جیتے۔ کسی طرف سے آواز آتی تھی کہ چوپڑ دی اسٹیشن ماسٹر جیتے۔ مگر ان مسافروں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کو یہ فکر تھی کہ کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہو۔ منجملہ ان کے ہم اور ہمارے ہم سفر بھی تھے جن کو اب کان پور جانے کی تو جلدی نہ تھی‘ البتہ جلدی اس بات کی ضرور تھی کہ کس طرح یہ سفر جو سر پر سوار ہونے کے بعد اترنے کا نام ہی نہیں لیتا کسی طرح جلد ختم ہو اور ہم گھر واپس پہنچ کر شکرانہ کی نماز پڑھیں۔ ہم دونوں سچے دل سے اس کے لیے بے چین تھے کہ کسی طرح ان دونوں میں مصالحت ہو جائے اور ٹرین آگے بڑھے یا پھر لکھنو ہی واپس چلی جائے۔ بلکہ ہم نے تو اپنے شریک سفر سے یہ بھی کہا کہ ’’چلیے یہاں سے پیدل ہی لکھنو چلیں۔‘‘ مگر وہ حضرت کسی طرح راضی نہ ہوئے حالانکہ واقعی اموسی سے لکھنو کا پیدل سفر اموسی سے کان پور اور کان پور سے لکھنو کی ریل کے سفر سے کہیں زیادہ آسان تھا۔ مگر ہمارے عقل کے بیل شریک سفر صاحب کو یہ تمام مصیبتیں گوارا تھیں البتہ وہ پیدل چلنے کے نام سے خدا جانے کیوں عالم نزع میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ بہر حال ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ یہ تمام مصیبتیں جھیلیں۔ لہٰذا اپنی قسمت پر شاکر‘ یہ تمام تماشے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور اور اسٹیشن ماسٹر کی کشتی میں برابر جوش و خروش کا سلسلہ جاری تھا اور اس گتھم گتھا کے علاوہ اب تو نوچ کھسوٹ بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے کہ ڈرائیور کے چہرے پر خون ہی خون نظر آ رہا تھا اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو اس بری طرح کاٹا تھا کہ ان کا کان نہایت آسانی کے ساتھ ذرا سے جھٹکے میں زمین پر گر سکتا تھا۔ مگر عین اس وقت لوگوں نے چیخنا شروع کیا کہ ’’ٹرین کو ہٹاؤ مال گاڑی آ رہی ہے مال گاڑی۔‘‘

یہ شور و غل سن کر اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو چھوڑ دیا اور دونوں بے تحاشہ ٹرین کی طرف دوڑے‘ اسٹیشن ماسٹر نے مال گاڑی کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

’’میں مال گاڑی کو رکواتا ہوں ابھی بہت دور ہے جب تک اس ٹرین کو دوسری پٹڑی پر لگا دیا جائے۔‘‘

اس پر ڈرائیور نے انجن پر اچک کر اس کو آگے بڑھانے کے لیے بریک کھول دیا اور اس کے چلانے کے پرزے کو بھی حسب معمول حرکت دی مگر انجن میں کوئی جنبش نہ ہوئی‘ آخر اس نے گھبرا گھبرا کر رفتار تیز کرنے‘ سیٹی بجانے اور ٹرین کو حرکت میں لانے کی تمام پرزوں کو گھمایا پھرایا۔ مگر انجن کا تو یہ حال تھا کہ گویا بیچارے کی روح قفس عنصری سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی یا کم از کم فالج کا حملہ ہوا ہے۔ حد یہ تھی کہ ڈرائیور تو ڈرائیور‘ کلوفائرمین تک کی تمام مساعی جمیلہ بے کار ثابت ہو رہی تھیں‘ آخر کار سیکرٹری

صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی نے گھبرا کر چیخنا شروع کیا۔

’’ارے صاحب کیا سب کی جان لو گے ٹرین لڑاؤ گے۔ کیا مطلب ہے؟‘‘ کلو فائر مین نے کہا ’’مہاراج یہ چلتا ہی نہیں آخر کیا کیا جائے‘ ذرا اپنی جگہ سے ہلے تو شاید کچھ جان پیدا ہو۔‘‘

سیکرٹری صاحب ٹاؤن کمیٹی نے پکار کر کہا ’’وہ دیکھئے سامنے بیل گاڑی جا رہی ہے اس کے بیل کھول کر اسی میں جوت دیجئے شاید اسی سے حرکت ہو۔‘‘

کلو فائر مین نے بھی اس تجویز کو کچھ مناسب خیال کیا اور لپک کر بیل گاڑی کے بیل باوجود گاڑی بان کے ’’ہاں ہاں‘‘ کے کھول لیے اور انجن میں لا کر باندھ دیے مگر ان کی زور آزمائی بھی بے کار ثابت ہوئی آخر کار ایک لال بجھکو مسافر نے چیخ کر کہا ’’صاحب کوئلہ بھی ہے یا نہیں۔‘‘

ڈرائیور نے کہا ’’ہاں کوئلہ ابھی بہت ہے۔‘‘

ایک اور مسافر نے کہا ’’اور انجن میں پانی۔‘‘

کلو فائر مین نے تجربہ کارانہ انداز سے کہا۔ ’’ہاں جی ذرا پانی تو دیکھو‘‘ ڈرائیور نے انجن کی ٹنکی میں پانی جو دیکھا تو واقعی ندارد تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ انجن کو کیا عذر تھا مگر اب سوال یہ تھا کہ پانی آئے تو کہاں سے‘ اس لیے کہ انجن تو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتا تھا‘ پائپ تک جانا تو درکنار۔ آخر سب نے یہ تجویز کی کہ قریبی کنوئیں سے پانی بھرنے والیوں کے گھڑے چھین چھین کر پانی بھر دیا جائے اس تجویز پر عمل بھی شروع ہو گیا تھا یکایک وہ مال گاڑی آ گئی۔ ڈرائیور نے مال گاڑی کو دیکھتے ہی انجن پر سے پھاندتے ہوئے آواز لگا کر کہا۔

’’مال گاڑی روکو‘ ٹرین لڑتی ہے‘ مسافر گاڑی کھڑی ہے مسافر گاڑی‘‘ مگر جب مال گاڑی کسی طرح نہ رکی تو پھر ڈرائیور نے حلق پھاڑ پھاڑ کر آواز لگانا شروع کی کہ ’’مسافرو اترو گاڑی لڑتی ہے‘ جلدی کرو‘ ٹرین لڑتی ہے‘‘ مگر اس کا بھی نتیجہ کچھ نہ ہوا اس لیے کہ وہ مسافر جو اس تصادم کی خبر سن کر پہلے ہی سے اترے ہوئے تھے وہ تو خیر باہر رہے۔ لیکن اسٹیشن ماسٹر اموسی اور ڈرائیور کی لڑائی سے جو مسافر کنارہ کش ہو کر یا خوف زدہ ہو کر ٹرین میں گھس گئے تھے‘ نیچے نہ اترے‘ آخر گارڈ نے چلا کر کہا۔ ’’ڈرائیور جلدی کرو ٹرین کو بیک کرو‘ پیچھے چلاؤ‘ بہت تیزی کے ساتھ۔‘‘

یہ سننا تھا کہ بہت سے مسافر بھرا مار کر اپنے اپنے ڈبہ میں گھس گئے اور بہت اس کے باوجود ٹرین لڑنے کے خوف سے ٹرین پر سوار نہ ہوئے بلکہ اموسی اسٹیشن ہی پر کھڑے رہ گئے چنانچہ ہم تو سوار ہونے والوں میں تھے اور ہمارے شریک سفر اموسی اسٹیشن پر رہ جانے والوں میں تھے۔ لہٰذا ان کی خیریت تو معلوم نہ ہو سکی البتہ ہمارا یہ حال ہوا کہ ہماری ٹرین نہایت تیزی کے ساتھ ڈرائیور بیک کر رہا تھا اور اپنی جان پر کھیلے ہوئے تھا‘ ادھر مال گاڑی اس کا تعاقب کر رہی ادھر یہ بھی خیال تھا کہ کبھی ٹرین کو بیک کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے خدا جانے کیا افتادہ پیش آئے چنانچہ یہی ہوا کہ ایک جگہ پہنچ کر غالباً لکھنو اسٹیشن کے احاطہ کا کوئی کراسنگ تھا‘ ہماری ٹرین رک گئی رک کیا گئی‘ یہ کہیے کہ اٹک گئی اور باوجود انتہائی کوشش کے کسی طرح پیچھے نہ ہٹی تو ڈرائیور نے ایک چھلانگ ماری اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس ٹرین سے اس بری طرح متصادم ہوئی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر ہمارے منہ پر آ کر گرا اور ہم ایک دم سے چونک پڑے۔

حقہ کی نے‘ ہمارے منہ پر آ کر گری تھی اور ہم آرام کرسی پر بجنسہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے گویا رات بھر اس پر سوئے نہیں بلکہ رکھے رہے ہیں‘ غضب خدا کا کہ رات کو ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ کان پور کی ٹرین چھوڑی اور اس کے بعد بھی آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ سر پر کھیل رہی تھی۔

◆◆◆

باب2

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا۔ مگر ''بندے ماترم'' کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی یہ ضد ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو' بیمار ہوں' کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو' مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دوکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ۔

''بھائی ابھی آتے ہیں'' اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے۔ جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ' داڑھی مونچھ سے فارغ البال' ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ' ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے' ایک ہاتھ اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے۔ جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا' اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے' کبھی مغرب کی طرف اور کبھی ایک دم سے پیچھے مڑ جاتے تھے۔ بہر حال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا وہ تخت جس پر وہ کھڑے ہوئے گھوم رہے تھے۔ مجمع کی وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف' کبھی کسی کی طرف منہ' کبھی کسی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف اور کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں' ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہمارے طرف کے لوگ غل مچانے میں اتر' دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں رہے۔ پھر بھی جو کچھ سنا' بہت کافی تھا' اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں' کبھی اردو میں' کبھی نثر میں' کبھی نظم میں' کبھی ہنس کر' کبھی چیخ کر' کبھی ادھر مڑ کر' کبھی ادھر گھوم کر' وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے۔

''بھائیو اب وہ وقت نہیں ہے کہ رزولیشن پاس ہوں اور رہ جائیں ------ تجاویز منظور ہوں اور شرمندہ عمل نہ بنیں ------ سرگرمیاں ------ اب تیار ہو جاؤ ------ ہوشیار رہو ------ کہ تم کو ------ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء ------ کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ------ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ------ (دوسری طرف گھوم گئے)۔

خواب غفلت سے بیداری کا وقت ------ یہ ہے ------ اور وہاں تم ------ برٹش گورنمنٹ ------ سوراج' سودیشی ------ چرخہ ------ کھدر ------ (------ چیرز بعد تقریر ختم)۔

دو گھنٹہ میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انہوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں' ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا' ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے' خود دھکے کھاتے' کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے' دوکان پر آ کر حقہ کا نیچا لیا' صراحیاں یکہ پر لادیں اور گھر پہنچ گئے' اسباب باندھا' کھانا کھایا' حقہ بھرا اور آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے' گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے۔ اس لیے اطمینان بھی نصیب نہ تھا۔ مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔

اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی ہم اپنی ریل پر سفر کرتے۔ نہ بدیشی گارڈ ہوتا' نہ فارن ڈرائیور' نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے۔ چاہے تھرڈ میں بیٹھتے' چاہے فرسٹ میں ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی ''بندے ماترم'' کی آواز آئی اور ہم ایک دم کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے' دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بہت بڑا جلوس' جھنڈوں' جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا ''بندے ماترم'' کے نعروں سے زمین اور آسمان کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ ''بھائی یہ کیا ہے؟'' جواب ملا کہ کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟'' ہم نے اپنے دل میں کہا کہ ''واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو' ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔'' پھر سوچا ہم اور یہ لوگ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے۔ مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا کہ سوراج مل گیا ہوگا حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوش خبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ اور خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو خود اسٹیشن جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے۔ جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

”بابو جی کان پور کا سیکنڈ کلاس دے دیجئے۔“

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دیتے پہلے تو ہم کو گھورا' پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے۔

”ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟“

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے کہا۔ ”جناب سنئے تین روپے ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجئے۔“

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا۔

”جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے۔ آپ کہتے ہیں تین روپے' مجھے کان پور کا ٹکٹ چاہئے ہے۔ کان پور کا' سیکنڈ کلاس۔“

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا۔

”جناب والا؟ میں بہرا نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہئے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے۔ کوڑی کم نہ لوں گا' جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔“

میں ”مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنے کرایہ تھا کہ ایک دم بڑھ گیا۔“

بابو ”کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج دیش ہمارا ہے ہم کو سوراج مل گیا ہے۔“ میں ”یہ کہئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا ہے۔ اچھا ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔“

بابو ”لائیے روپے' اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے۔“

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

”سنئے تو جناب' ٹھہریئے تو جناب' دیکھئے تو جناب' اچھا دو روپے دے دیجئے۔ آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دے دیجئے۔ اب وہ بھی نہ دیجئے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔“

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔

”ایک روپیہ دیں گے۔ ایک روپے کو دینا ہو دے دو۔“

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے۔

”لائیے صاحب لائیے بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔“

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا۔ لیکن وہ ٹکٹ ریل کا ٹکٹ معلوم نہیں ہوتا تھا نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر ”درجہ دوم کان پور“ لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا' ادھر سے دیکھا۔ اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے۔

”جناب والا رات کو سوراجیہ ملا ہے۔ ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں۔ وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب' آپ تو سفر کیجئے۔ اب آپ سے کوئی نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔“

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے اور نہ کرایہ' نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے۔ انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر یا تو روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنے کے نفع میں رہے ہم اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سامان کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا الٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی' وہی گھڑیال' مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دوکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا

تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بہ مشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے چین بجبیں ہو کر جواب دیا۔

”اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر۔“ ہم ”معاف کیجیے گا غلطی ہوئی“ کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ ”یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہوگا۔ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں رکھا۔ جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے ان ہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبے میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا کہ ”کا جانی بھیا ہم کا ناہیں مالوم“ یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے‘ ان سے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ”اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلے جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے۔ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف ہم نے گھبرا کر پوچھا۔“

”لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟“

جواب ملا کہ ”جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔“

ہم نے پھر پوچھا ”لیکن ٹرین کا تو وقت ہو چکا۔“

جواب ملا ”ہو جایا کرے جب تک ریل بھر نہ جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے۔ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے۔“

اب ہم بالکل راضی برضا ہو کر بالکل خاموش ہو گئے۔ اس نظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی۔ اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا۔ جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبے میں بیٹھ کر‘ کبھی لوٹے میں پانی لا کر‘ کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر‘ کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک ڈھونڈ کر‘ کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر‘ وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ‘ بارہ سے ایک‘ ایک سے دو بجے مگر گھڑی کی سوئی ہٹی‘ نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی‘ صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے با آواز بلند چیخنا شروع کیا۔ ”بیٹھنے والے مسافرو! بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے۔“ ہم نے

جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈا پھر مغرب کی طرف‘ مگر دونوں انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھے تھے۔ بہرحال کچھ سوچ سمجھ ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے۔ ان سے ہم نے لاکھ لاکھ کہا۔ ”ارے سیکنڈ کلاس ہے‘ اماں سیکنڈ کلاس ہے‘ بھائی سیکنڈ کلاس ہے“ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے ”ہم ہو جانت ہنم ڈیوڑھا ہے ہم ہو ٹکس لیا ہے۔“

خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں کہ مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً ان ہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے عرض کیا جس کا جواب انہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا۔ ”بیٹھے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں‘ سب بھائی ہیں‘ سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں‘ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جایئے‘ سب کو برابر سمجھئے‘ جایئے تشریف رکھئے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔“ ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنی جگہ پر آ گئے‘ جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر طے ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا مگر گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پھر پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے وہ کانپور جائیں گے۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی بلانے کے لیے گیا ہوا ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں‘ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا‘ گاڑی چھوٹتی نہ تھی‘ اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجب کشمکش میں جان تھی‘ معلوم نہیں وہ کون سا وقت تھا۔ جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا۔ کیوں کہ کفران نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگایا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے ”بندے ماترم“ کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے ہیں۔

ہم نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج

دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرضیکہ ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش‘ چپل زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر بھی سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ”گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔“ ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا۔ ”جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں میرا کیا قصور ہے دو گھنٹہ سے کلو فائر مین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آؤ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا‘ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر گیا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔“ گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہوئے۔ انجن میں بڑی بری بات ہے کہ وہ کوئلہ کے بغیر چل نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دور بھوکا بھی چل سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے ریل بھی تھی۔ انجن بھی‘ مسافر بھی تھے‘ گارڈ بھی‘ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کلو فائر مین کوئلے کی گٹھری لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا۔

”آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دوکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنے میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں‘ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔“

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔ ”رکو‘ رکو‘ گارڈ صاحب رہ گئے ہیں۔“ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی بمشکل چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا۔ ”ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا۔ لائن کلیر“ ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا۔ ”ہاں لے لیا تھا۔ لے لیا تھا“ گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا۔ ”اچھا تو چھوڑو گاڑی‘ میں سیٹی بجاتا ہوں۔“ گاڑی پھر چلی‘ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس‘ اس لیے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا۔ ”کیوں صاحب یہ میل ہے ای ایکسپریس“ وہ پہلے ہی سے کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے‘ غصہ ہم پر اتارا‘ اور جھڑک کر فرمانے لگے۔ ”میاں خدا کا شکر بھیجو کہ یہ گاڑی ہے‘ تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو۔“ ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی۔ مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے تھے۔ لوگ گاڑی سے اترتے تھے۔ پیشاب کرتے تھے اور پھر دوڑ کر سوار ہو جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی‘ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی‘ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہوا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ۔

”جب تک میں سگنل نہیں دیا تو کوا سٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون سا تھا۔“

ڈرائیور ”جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی‘ تو آپ نے سگنل کیوں نہیں دیا۔“

اسٹیشن ماسٹر ”ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا۔ دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی‘ اگر گاڑی لڑ جاتی۔ تمہارا کیا جاتا۔ آئی گئی سب ہم پر آتی۔“

ڈرائیور ”دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجئے۔ نوکری کی ہے‘ عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں‘ اچھا کیا گاڑی لائے خوب کیا گاڑی لائے‘ اب اس ضد پر ہزار مرتبہ لائیں گے دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے۔“

اسٹیشن ماسٹر ”دیکھئے گارڈ صاحب منع کر لیجئے اس کو‘ کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں‘ میں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں۔“ گارڈ نے کہا۔ ”اماں جانے بھی دو۔ ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو‘ اماں تم ہی ہٹ جاؤ‘ بھائی تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے ارے چھوڑو بھی‘ ہٹو بھی‘ سنو تو سہی‘ ارے یار سنو تو۔“

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے لاتیں تھپڑ جوتے رسید کرنے شروع کر دیئے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے‘ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بے چارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کر دیا۔ ”گارڈ صاحب! اے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پر آ رہی ہے‘ غضب ہو گیا۔“

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کیا۔ ”مسافرو جلدی اترو‘ جلدی اترو‘ گاڑی لڑتی ہے گاڑی لڑتی ہے جلدی

اترو۔“

سب مسافر گڑ بڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آ پڑا۔

میں ایک دم سے چونک پڑا۔

حقہ کی ”نے“ میرے منہ پر آ گری تھی۔ حقہ جل چکا تھا۔ آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس لیے کہ اب گاڑی تو چھوٹ چکی تھی اب ہو ہی کیا سکتا تھا بجز آرام سے سونے کے۔

◆◆◆